خطوطِ غالبؔ

مرتّبہ

غلام رسول مہرؔ

کتابؔ منزل۔ لاہور

بار .... اوّل

قیمت ....

شیخ نیاز احمد پرنٹرز و پبلشرز نے پاکستان ٹائمز پریس لاہور
سے طبع کرا کے کشمیری بازار لاہور سے شائع کی

فہرست

خواجہ غلام غوث خاں بے خبر

خواجہ غلام غوث خاں بےؔ خبر کے اجداد کا اصلی وطن خطّۂ جنّت نظیر کشمیر تھا۔ کہتے ہیں کہ ان کا سلسلہ نسب سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ، فرمانروائے کشمیر سے ملتا تھا۔ جب مغل کشمیر کے فرمانروا بنے تو خواجہ صاحب کے اجداد کو علم و فضل اور عالی نسبی کی بناء پر عہدۂ قضا ملا اور کئی پشتوں تک اس خاندان میں یہ اعزاز قائم رہا۔ مغلوں کے زوال پر کشمیر کا امن و سکون درہم برہم ہُوا تو نہ محض وجہ معاش ہی کا معاملہ ضغطے میں پڑا بلکہ اطمینان سے گھر بیٹھے رہنا بھی غیر ممکن ہو گیا۔ اس زمانے میں بےؔ خبر کے دادا خواجہ خیرالدین اپنے مختلف اقربا کے ساتھ کشمیر سے نکل کر پہلے لہاسا (تبت) پہنچے، پھر نیپال میں مقیم ہو گئے۔ بےؔ خبر کے مختلف سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ جب گلاب سنگھ کشمیر پر مسلّط ہُوا تو اس کے عہد میں عہدۂ قضا تخفیف میں آیا۔ اس کے بعد خواجہ خیرالدین وطن سے نکلے۔ یہ صحیح نہیں اس لیے کہ گلاب سنگھ ۱۸۴۶ء میں کشمیر پر قابض ہُوا اس سے چھبیس ستائیس برس پیشتر سکھ کشمیر لے چکے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ترک وطن کا واقعہ اس سے بھی پہلے کا ہے۔

بہر حال نیپال ہی میں خواجہ خیرالدین کشمیری کے صاحبزادے خواجہ حضور اللہ کی شادی ایک نہایت قریبی رشتہ دار خواجہ فریدالدین کی دختر سے ہوئی اور وہیں ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۴ء) میں خواجہ غلام غوث خاں پیدا ہوئے۔

خواجہ خیرالدین آبائی عہدے کے چھنتے ہی تجارت شروع کر چکے تھے، غالباً کاروبار ہی کے سلسلے میں یہ خاندان نیپال سے نکل کر بنارس پہنچا۔ خواجہ غلام غوث نے بنارس ہی میں تعلیم اور ابتدائی نشو و نما پائی۔

ان کے ماموں سید محمد خاں نے انگریزی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ بعد میں وہ

ترقی کرتے کرتے صوبہ غرب و شمال (آگرہ و اودھ) کے لفٹنٹ گورنر کے میر منشی بن گئے۔ اور "خان بہادر" کا خطاب حاصل کیا۔ چنانچہ خواجہ غلام غوث بھی ۱۸۴۲ء میں جب کہ ان کی عمر سولہ برس کی تھی اپنے ماموں کے ماتحت ملازم ہو گئے اور اس تعلق کی وجہ سے انھیں آگرے میں اقامت اختیار کرنی پڑی جو اس زمانے میں لفٹنٹ گورنر کا صدر مقام تھا۔ ۱۸۴۳ء میں لارڈ ایلن برا کے عہد میں گوالیار پر چڑھائی ہوئی تو خواجہ صاحب کو عارضی طور پر گورنر جنرل کے منشی خانے میں منسلک کر دیا گیا۔ مہم کے خاتمے پر خلعت کا اعزاز ملا۔

جب خان بہادر خواجہ سید محمد خاں پنشن لے کر ملازمت سے سبک دوش ہوئے، تو ان کے حسن کارگزاری کے صلے میں اور خواجہ غلام غوث خاں کی صلاحیت کی بناء پر انھیں میر منشی بنا دیا گیا۔ اس عہدے پر وہ ۱۸۵۹ء تک فائز رہے اور خود بہ اصرار درخواست کر کے پنشن لی۔ انگریز چاہتے تھے کہ وہ ملازمت کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ۱۸۴۵ء میں خواجہ صاحب کی شادی گوپامئو کے مفتی انعام اللہ خاں صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ پنشن کے بعد آپ الہ آباد میں مقیم ہو گئے اور وہیں ۱۸۔ شوال المکرم ۱۳۲۲ھ (مطابق ۲۶۔ دسمبر ۱۹۰۴ء) کو رات کے پونے دس بجے فوت ہوئے۔ دائرہ شاہ محمدی میں دفن کیا گیا۔ مندرجہ ذیل تاریخ آپ کے لوحِ مزار پر کندہ ہے:۔

آں خواجہؒ کہ بود بہ نام او غلام غوث
خوش روے و خوش لباس و خوش اندام و خوش سرشت

روشن شد از سواد بیاضِ صفاتِ او
توقیعِ رقعتے کہ بہ نامش قضا نوشت

در قیل و قال ہم نفسِ شاعرانِ فرس
در وجد و حال ہم اثرِ خواجگانِ چشت

گوئی بہ رنگِ بوے گل و چوں نسیمِ صبح
سوے بہشت رفتہ و ایں کشت را بہشت

رضوانش دیدہ گفت کہ ایں نو رسیدہ کیست
گفتند حوریاں جناں خواجۂ بہشت

بے حد خوش اخلاق اور وضعدار بزرگ تھے۔ شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ مرحوم کا بیان ہے کہ مَیں جس زمانے میں الہ آباد میں تھا روزانہ ملنے کے لیے آتے۔ باوجود کبر سن توانا، تندرست، خوش خوراک اور خوش پوشاک تھے۔ ۱۸۷۰ء میں خضاب چھوڑا۔ اتوار کے دن احباب کا مجمع آٹھ نو بجے سے شروع ہوتا۔ سب لوگ خواجہ صاحب کے ساتھ کھانا کھاتے۔ دن بھر لطائف اور شعر و سخن کا سلسلہ جاری رہتا۔

میرزا محمد عسکری نے ادبی نکات غالب میں ان کی روزانہ نشست کا حال یوں بیان کیا ہے :۔

خواجہ صاحب نماز عصر سے فراغت کر کے باہر تشریف لاتے تھے۔ مَیں نے ایسی پابندی وقت اور پابندی وضع کسی دوسرے ہندوستانی میں نہیں دیکھی۔ صحن میں چھڑکاؤ ہو کر کرسیاں، مونڈھے دو رویہ بچھا دِیے جاتے تھے۔ صدر میں ایک اُونچی کرسی، سامنے ایک چھوٹی سی میز جس پر خاصدان رکھا جاتا تھا۔ اِدھر اُدھر دو بڑے گل دان، جناب مرحوم پابندی وقت کے ساتھ ہاتھ میں تسبیح لیے محل سرا سے برآمد ہوتے اور اسی صدر کی کرسی پر متمکن ہو جاتے۔ دونوں طرف کرسیوں اور مونڈھوں پر لوگ اپنے اپنے مرتبے نیز بہ اعتبار اس درجۂ ارتباط اور دوستی کے جو خواجہ صاحب کے ساتھ ان کو حاصل ہوتا، اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ جو شخص ایک مرتبہ کرسی پر بیٹھا ہو، وہ دوسرے دن مونڈھے پر بیٹھے یا برعکس اس کے مونڈھے پر بیٹھنے والا کرسی نشینی کی جراءت کرے۔"

غرض خواجہ صاحب مشرقی تہذیب کا ایک جامع نمونہ تھے۔ ان کے فارسی نظم و نثر

کا مجموعہ "خونابۂ جگر" کے نام سے طبع ہوا۔ اُردو نظم ونثر کا مجموعہ "فغانِ بے خبر" کے نام سے چھپا۔ وفات کے بعد بقیہ کلام نظم ونثر کا مجموعہ "لعل وگہر" کے نام سے شائع ہوا۔ اُردو خطوط انشا "بے خبر" کے نام سے طبع ہوئے ہیں "عودِ ہندی" کی ترتیب خواجہ صاحب ہی کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ بے خبر غالب کے ان چند دوستوں میں سے تھے، جن پر مرحوم کو ہمیشہ زیادہ سے زیادہ اعتماد رہا۔

خواجہ صاحب کے احباب کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی نے "انشاءِ بے خبر" کے مقدمے میں ستر سے زیادہ اکابر کی فہرست دی ہے جو خواجہ صاحب کے گہرے دوست تھے۔ ان میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور انگریز بھی شامل تھے۔

میرزا حاتم علی بیگ مہر کے ساتھ بھی بھائیوں کے سے تعلقات تھے۔ آگرے کے زمانۂ قیام میں ایک مرتبہ خواجہ صاحب بیمار ہو گئے۔ مہر کو اطلاع نہ ملی اور عیادت کے لیے نہ آسکے۔ تندرستی کے بعد بیماری کی کیفیت معلوم ہوئی تو مندرجہ ذیل قطعہ معذرت میں بھیجا:

منشی غلام غوث ہیں مشہور بے خبر — ہم سا بھی بے خبر مگر اے مہر کم ہوا
ان کے علیل ہونے کا فصلِ وبائی میں — مطلق نہ ہم کو علم خدا کی قسم ہوا
اب جو سنا تو رنج ہوا، پر یہ شکر ہے — اس سے سوا خوشی ہوئی جتنا کہ غم ہوا

ہاتف نے ایک مصرعِ تاریخ پڑھ دیا
اچھی طرح سے ہیں، یہ خدا کا کرم ہوا

(۱)

پیر و مرشد

یہ خط ہے یا کرامت؟ صفائے ضمیر وکشفِ حجب[1] کی علامت ہے۔

---

[1] پردوں کا کھلنا

مدعا ضروری التحریر اور اندیشۂ نشانِ مسکن دامنگیر۔ اگر یہ خط کل نہ آجاتا تو آج خط کیونکر لکھا جاتا؟ سبحان اللہ! جس دن یہاں مجھ کو وہ مطلب خطیر پیش آیا ہے اسی دن آپ نے وہاں لکھنے کو قلم اُٹھایا ہے۔ آپ کو عارفِ کامل کیونکر نہ لکھوں اور کیا کہوں ولی نہ کہوں؟ مدعا بیان کرتا ہوں، مگر یہ گمان کرتا ہوں کہ یہ خط پہنچنے نہ پائے گا کہ رازِ سربستہ آپ پر کھل جائے گا۔ یعنی یک شنبہ ۲۸ نومبر کو دو خط اور دو پارسل، ایک میں "دستنبو" کا ایک مجلد اور ایک میں تین معاً[1] بسبیلِ ڈاک روانہ کر چکا ہوں۔ خطوں کا چوتھے پانچویں دن، پارسلوں کا چھٹے ساتویں دن پہنچنا خیال کرتا ہوں۔ پارسلوں کے عنوان پر خطوں کی معیت رقم کی ہے اور خطوں کے سرنامہ پر پارسلوں سے ارسال کی اطلاع دی ہے۔ تین کتاب والے پارسل اور ایک خط پر جناب سکرتر بہادر کا نام نامی ہے اور ایک کتاب والے پارسل اور ایک خط پر جناب چیف سکرتر بہادر دوم کا اسم سامی ہے۔ آج پانچواں دن ہے۔ خط دونوں اگر پہنچ گئے ہوں تو کیا عجب ہے، بلکہ سچ تو یوں ہے کہ اگر نہ پہنچے ہوں تو بڑا غضب ہے۔ اگلے عرائض کے نہ پہنچنے میں کچھ شک نہیں۔ جواب امر آخری دفتر میں اس کا پتہ آج تک نہیں۔ اب کارپردازانِ ڈاک ڈاکو نہ بن جائیں اور میرے ان دونوں خطوں اور پارسلوں کو بہ احتیاط پہنچائیں۔ صرفِ عنایت[2] کی گنجایش تو آپ جب پائیں کہ وہ خط اور پارسل پہنچ جائیں۔ ابھی تو آپ سے مجھ کو اُن کے پہنچنے نہ پہنچنے کا سوال ہے۔ کس واسطے کہ جب تک آپ مجھ کو اطلاع نہ دیں گے، ان کے نہ پہنچنے کی بھی خبر مجھ تک پہنچنی محال ہے۔ بہ ہر حال یہ نیاز نامہ جس دن پہنچے اس کے دوسرے دن جواب لکھیے۔ جیسا میں نے جلد لکھا، ایسا ہی آپ بھی شتاب لکھیے۔ آپ کے

---

[1] یعنی اکٹھے [2] عنایت کرنا۔ صرف کا ص مفتوح ہے۔

عنایت نامے میں کوئی امر ایسا نہ تھا کہ جس کا جواب لکھا جائے یا اس باب میں کچھ اور عرض کیا جائے۔ لوہارو کی روانگی کا خط آئے گا، لوہارو کو بھیج دیا جائے گا۔ جناب منشی نواب جان صاحب اور جناب منشی اظہار حسین صاحب ہیں اور آپ میں اگر ربط بے تکلف ہو تو ان دو صاحبوں کی خدمت میں میرا اسلام نیاز پہنچانے میں نہ توقف ہو۔

تم سلامت رہو قیامت تک

۲۔ دسمبر ۱۸۵۶ء

(۲)

قبلہ

اس نامۂ مختصر نے وہ کیا جو پارۂ ابر کشتِ خشک سے کرے، یعنی خط اور پارسل[۱] کا پہنچ جانا ایسا نہیں کہ اس کی خبر پاکر بخت کی رسائی کا سپاس گزار نہ ہوں۔ یہ تو حضرت کو لکھ چکا ہوں کہ دوسرا پارسل اور خط ایک ساتھ بھیجا گیا ہے۔ اور ہر گونہ توقع کا خیال اسی پارسل پر ہے۔ کس واسطے، کہ اس خط میں حاکم اعظم کے نام کی عرضی ملفوف ہے۔ جانتا ہوں کہ محکمہ ایک، ڈاک ایک، دونوں لفافے ایک دن پہنچے ہوں گے۔ مگر دل نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ نہ مانوں گا، جب تک کہ حضرت اس سر رشتے سے معلوم کر کے نہ لکھیں گے۔ اب آپ جانیے اور یہ دل سودا زدہ۔ مَیں اس کی سفارش کرنے والا اور اس کے مدعا کا گزارش کرنے والا کون؟ ہاں اتنی بات ہے کہ آپ لکھ سکتے ہیں، بلکہ یہ بھی آپ مجھ پر حالی کر سکتے ہیں کہ نذر ولایت کی، ولایت کو روانہ ہوئی یا نہیں؟ میری جگر کاوی کی قدردانی ہوئی یا نہیں؟ پیشگاہ سے موافق دستور کے خط کا امیدوار ہوں یا نہیں؟

---

[۱] اس سے مقصود دستنبوے کا پارسل ہے جسے میرزا انجاح مقاصد مہمہ کی کلید سمجھتے تھے۔

اپنے حسن طبع کا شکرگزار ہوں یا نہیں؟ اس خط کا جواب جتنا جلد عنایت کیجیے گا، مجھ کو جلا لیجیے گا۔ لوہارو کا خط ایک معتمد کے ہاتھ بھیج دیا گیا۔

(۳)

قبلہ حاجات

عطوفت نامہ کے آنے سے آپ کا بھی شکرگزار ہوا اور اپنے بخت اور قسمت کو بھی آفرین کہی اور ڈاک کے کارپردازوں کا بھی احسان مانا۔ بارے دونوں پارسل اور دونوں لفافے پہنچ گئے:

تا نہال دوستی کے بر دہد حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

یہ کتاب جو مرسل الیہ کے مطالعہ میں ہے، پھر بہ نسبت اُس دوسری کتاب کے قسمت کی اچھی ہے، یعنی خود ملاحظہ فرما رہے ہیں اور اگر کہیں کچھ پوچھنا ہو گا تو یقین ہے کہ آپ سے پوچھیں گے۔ دوسری کتاب دیکھیے مجھ کو کیا دکھائے؟ جن کو اُس کے دیکھنے کا حکم ہوا ہے، وہ اہل علم و فضل میں سے ہیں۔ لیکن یہ طرزِ تحریر، میں نہیں کہتا کہ یہ نادر ہے، مگر بیگانہ و ناآشنا ہے۔ خدا کرے وہ جو اس کے سر پہ مامور ہیں ان اوراق کو بمشورت آپ کے دیکھا کریں اور کہیں کہیں آپ سے پوچھ لیا کریں۔ کیوں کر لکھوں، نہیں لکھ سکتا۔ تم سب کچھ جانتے ہو۔ جہاں گنجایش پاؤ گے جیسا مناسب جانو گے، جو کچھ کر سکو گے، وہ کرو گے۔ لوہارو کا خط بہ کمال احتیاط روانہ ہو گیا، خاطرِ اقدس جمع رہے۔ جواب طلب زیادہ حدِ ادب۔

دسمبر ۱۸۵۸ء

(۴)

جناب عالی

آج دوشنبہ ۳۔ جنوری ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہو گا کہ ابر گھر رہا ہے،

ترشح ہو رہا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے، پینے کو کچھ میسّر نہیں۔ ناچار روٹی کھائی ہے:

افق ہا پُر از ابرِ بہمن مہی سفالینہ جامِ من از مَے تہی

غم زدہ و دردمند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط لایا۔ سرنامے کو دیکھ کر اس راہ سے کہ دستخط خاص کا لکھا ہوا ہے، بہت خوش ہوا۔ خط کو پڑھ کر اس رو سے کہ حصولِ مدعا کے ذکر پر حاوی نہ تھا، افسردگی حاصل ہوئی:

ما خانہ رمیدگانِ ظلمیم پیغامِ خوش از دیارِ ما نیست

اس افسردگی میں جی چاہا کہ حضرت سے باتیں کروں۔ باآنکہ خط جواب طلب نہ تھا، جواب لکھنے لگا۔

پہلے تو یہ سُنیے کہ آپ کے دوست کو آپ کا خط پہنچ گیا، مگر وہ دوبار مجھ کو لکھ چکا ہے کہ میں جواب اس کا نشانِ مرقومہ لفافہ کے مطابق ڈاک میں بھیج چکا ہوں جواب الجواب کا منتظر ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ کمال یاس مقتضی استغنا ہے، پس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بامیدِ مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستغنی ہوتا چلا ہوں کہ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے، ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے۔ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے؟ چاہے الہام سمجھیے چاہے اوہام سمجھیے بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم چوں نظیری نماند و طالب مرد
در بگویند در کدامی سال مُرد غالبؔ، بگو کہ "غالب مرد"

اب بارہ سو چھتر ہیں اور "غالب مُرد" بارہ سو ستہتر ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ

---

۱ یعنی شراب نہیں۔

مسرت پہنچنی ہو، پہنچ لے، ورنہ پھر ہم کہاں۔
۳۔جنوری سنہ ۱۸۵۹ء

(۵)

قبلہ

کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے، وہ کیا کھاتا پیتا ہے، اور کیونکر جیتا ہے؟ پنشن قدیم کیسی، مٹنے سے بنہ اوپر سادہ دل فتوح جدید کا آرزومند۔ پنشن کا احاطۂ پنجاب کے حکام پر مدار ہے۔ سو ان کا یہ شیوہ اور یہ شعار ہے کہ نہ روپیہ دیتے ہیں، نہ جواب۔ نہ مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب۔ خیر، اس سے قطع نظر کی، اب سُنیے اُدھر کی۔ سنہ ۱۸۵۶ء سے موجب تحریر وزیر، عطیۂ شاہی کا امیدوار ہوں[۱]۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں اگر گنہ گار ہوں۔ گنہ گار ٹھہرتا، گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بےگناہ ہوں، قید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیشگاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھجوایا ہے، بقلم چیف سکرتر بہادر اس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجیں، ایک پیش کش گورنمنٹ اور ایک نذر شاہی ہے۔ نہ اس کے قبول کی اطلاع، نہ اس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی۔ ان کی بھی کوئی تحریر مجھ کو نہ آئی۔ یہ سب ایک طرف، اب خبریں ہیں مختلف۔ کہتے ہیں کہ چیف سکرتر بہادر لفٹنٹ گورنر ہوئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی جگہ کون سے صاحب عالیشان چیف سکرتر ہوئے؟ مشہور ہے کہ جناب ولیم میور صاحب بہادر

---

[۱] اس عطیہ شاہی سے مراد ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے صلہ مدح ہے جس کی غالب نے خود تصریح کی ہے کہ ایک قصیدہ لارڈ ایلن برا کی وساطت سے بھجوایا تھا۔ وزیر اعظم برطانیہ نے لکھا کہ جو حکم جاری ہوگا حکومت ہند کے ذریعہ سے جاری ہوگا۔ جنوری سنہ ۱۸۵۵ء میں یہ اطلاع میرزا کو پہنچی۔ دو تین مہینے خوش خوش امید میں گزارے۔ پھر غدر شروع ہوگیا۔

صدر بورڈ میں تشریف لے گئے، یہ کوئی نہیں بتاتا کہ لفٹنٹ گورنری کے سکرتر کا کام کس کو دے گئے؟ آپ کا حال کوئی نہیں کہتا کہ اب کہاں ہیں؟ ہاں از روئے قیاس جانتا ہوں کہ آپ اسی منصب اور اسی دفتر میں شاد و شادماں ہیں۔ جواب لفٹنٹی کے سکرتر ہوئے ہوں گے، اُن سے علاقہ رہتا ہوگا۔ میور صاحب بہادر سے کام ہے کیا [illegible] تا۔ لفٹنٹ گورنری اور صدر بورڈ یہ دونو محکمے الہ آباد آ گئے یا آئیں گے بہ ہر حال آپ اب کیوں آگرے کو جائیں گے۔

نواب گورنر جنرل بہادر کی روانگی کی خبر میں اختلاف ہے کوئی کہتا ہے کہ ۲۰۔ جنوری کو گئے، کوئی کہتا ہے فروری میں کوچ فرمائیں گے۔ میں تو ادھر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا، ہر طرح اپنی قسمت کو رو بیٹھا۔ مگر یہ چاہتا ہوں حقیقت واقعی بر کماحقہ اطلاع حاصل ہو، تا کہ تسلّی خاطر اور تسکین دل ہو۔ اگر ان مطالب کا جواب، نہ مجمل بلکہ مفصل، نہ بہ دیر بلکہ جلد مرحمت کیجیے گا تو گویا مجھ کو مول لے لیجیے گا۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں؟

۳۰۔ جنوری ۱۸۵۹ء

(۶)

قبلہ حاجات

قطعے میں جو حضرت نے الہام درج کیا ہے، وہ تو ایک لطیفہ بسبیل دعا ہے. مگر ہاں یہ کشف یقینی ہے اور مخدوم کی روشن دلی اور دور بینی ہے کہ جو سوالات میں نے ۲۰۔ جنوری کو کیے ان کے جواب تم نے ۲۷۔ جنوری کو لکھ کر بھیج دیے۔ کیوں نہ کہوں روشن ضمیر ہو۔ اگرچہ جوان ہو مگر میرے پیر ہو۔ خلاصہ تقریر کہ ۳۰۔ جنوری کو آخر روز میں نے ڈاک میں خط بھجوایا اور ۳۱ کو ڈاک کا ہرکارہ پہر دن چڑھے تمھارا خط لایا۔ سوالات میں ایک سوال کا جواب باقی رہا۔ یعنی جناب ایڈمنسٹن

صاحب بہادر کی جگہ چیف سکرتر گورنمنٹ کلکتہ کون ہُوا؟ یہ دل میں پیچ و تاب باقی رہا۔

کتاب کے باب میں جو کچھ لکھا ہے، واقعی یہ درست اور بجا ہے۔ جو کچھ واقع ہُوا اُس کو مفید مطلب فرض کروں، لیکن اگر اجازت پاؤں تو اسی باب میں یہ عرض کروں کہ پیشگاہ گورنمنٹ میں بتوسط چیف سکرتر بہادر سابق اور لفٹننٹ گورنر بہادر حال؛ دو مجلد پیش کیے ہیں۔ ایک نذر گورنمنٹ اور دوسری کے واسطے یہ سوال کہ میری عزت بڑھائی جائے اور یہ مجلد حضور شاہنشاہی میں بھجوائی جائے۔ اچھا۔ نذر گورنمنٹ میں تو مولوی اظہار حسین صاحب کا وہ اظہار ہے، نذر سلطانی کے ارسال و عدم ارسال میں کیا دار و مدار ہے؟ دو نسخے جو اُن دونوں صاحبوں کے پیش کش مقرر ہوئے، ان میں سے ایک صدر بورڈ کے حاکم اور لفٹنٹ گورنر ہُوئے رد و قبول، نفرین و آفرین کچھ بھی نہیں۔ قیاساً جو چاہوں سو کروں، یقین کچھ بھی نہیں۔

۱۷۔ دسمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہُوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدہ کے صلے اور جائزے کے واسطے کہ جو بتوسط لارڈ الن برا' سائل نے بھجوایا ہے، خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے، جو حکم صادر ہو گا' سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی ضرور ہے۔ یہ حکم مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں مَیں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب اور دوسرے قصیدے کے جا بجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل محکمہ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔ جب یہاں سے نوید تحسین نہیں، تو ولایت کو نذر کے ارسال کا بھی یقین نہیں۔ تحسین اور آفرین سے قطع نظر نذر کے ولایت جانے کا یقین کیوں کر

حاصل ہو، جہاں یہ تفرقہ اور بے التفاتی اور یہ دشواری اور یہ مشکل ہو؟ جی میں آتا ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادر اور حاکم صدر بورڈ کو ایک عریضہ جدا جدا لکھوں، پھر یہ سوچتا ہوں کہ انگریزی لکھواؤں۔ فارسی لکھوں، اور دونوں صورتوں میں کیا لکھوں؟ کل کا بھیجا ہوا خط اور یہ آج کا خط یقین ہے کہ دونوں معاً ایک وقت میں پہنچیں۔ وہ تو جواب طلب نہیں، اس کا جواب لکھیے اور بہت شتاب لکھیے۔

۳۱۔ جنوری ۱۸۶۰ء

(۷)

حضور

خدا کا شکر، پھر آپ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ آپ نے خط لکھا اور میرا حال پوچھا۔ یہ پرسش حکم نشتر کا رکھتی ہے۔ اب رگ قلم کی خونابہ فشانی دیکھو۔ گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے، ان کو حکم دیا اور دربار عام میں سے سوائے میرے کوئی نہ تھا، یا چند مہاجن۔ مجھ کو کوئی حکم نہ پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا۔ جب یہ سرزمین مخیم خیام گورنری ہوئی، میں اپنی عادت قدیم کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا چیف سکرتر بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں۔ دوسرے دن پھر گیا۔ میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے، اب گورمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اس دن چلا آیا دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام کا لکھ کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنہ محض ہے، امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو، تاکہ میری صفائی اور بیگناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا، اب ماہ

گزشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے پس یہ مقدمہ طے ہوا۔ دربار و خلعت موقوف، پنسن مسدود، وجہ نامعلوم، لاموجود الا اللہ و لامؤثر فی الوجود الا اللہ۔

۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اِس سال ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اُردو کی بھیجتے، میں اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری، انگریزی پنسن کھُلا ہُوا، ان کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار ان کے عطیہ پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے، مَیں عذر کرتا تھا۔ جب جنوری ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ اوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رام پور گیا۔ چھ سات ہفتے وہاں رہ کر دِلّی آیا۔ یہاں آپ کا خط محررۂ ۸۔ مارچ پایا۔ جواب بھیجا جاتا ہے۔

مارچ ۱۸۶۰ء

(۸)

در نومیدی بسے امید است پایانِ شبِ سیہ سپید است

قبلہ

آج آپ کی خوشی اور خوشنودی کے واسطے اپنی روداد لکھتا ہوں۔

توطیہ: ۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی کو ساتھ لے گئے۔ مَیں نے کہا "مَیں بھی چلوں"، فرمایا کہ "نہیں"۔ جب لشکر میرٹھ سے دلّی میں آیا، موافق اپنے دستور کے، روزِ ورودِ لشکر مخیم میں گیا۔ میر منشی صاحب سے ملا۔ اُن کے خیمہ میں سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔

جواب آیا کہ تم غدر کے دنوں میں بادشاہِ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے، اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔ مَیں گدائے مبرم، اس حکم پر ممنوع نہ ہُوا۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے۔ مَیں نے قصیدہ حسب معمول قدیم بھیج دیا۔ مع اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ مَیں مایوس ہو کر بیٹھ رہا اور حکام شہر سے ملنا ترک کیا۔

واقعہ: اواخر ماہِ گزشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دلی آئے اہالی شہر، صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر و صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ مَیں تو بیگانۂ محض اور مطرودِ حکام تھا، جگہ سے نہ ہلا کسی سے نہ ملا۔ دربار ہُوا، ہر ایک کامگار ہُوا۔ شنبہ ۸۔ فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ بلایا گیا۔ مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی، وُہ بھی حاصل ہوئی۔ دو حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں، جو میرے تصوّر میں بھی نہ تھیں۔

جملہ معترضہ: میر منشی لفٹنٹ گورنر سے سابقۂ تعارف نہ تھا، وہ بطریق حسن طلب میرے خواہاں ہُوے تو مَیں گیا۔ جب حکام بمجرد استدعا مجھ سے بے تکلّف ملے، تو مَیں قیاس کرسکتا ہوں کہ میر منشی کی حسن طلب بایمائے حکام ہوگی۔ وللرحمٰن الطاف خفیہ۔

بقیہ روداد یہ ہے کہ دو شنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمھارا اور بار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ متحیرانہ مَیں نے پوچھا کہ حضرت کیوں کر؟ حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے

آگر تمھارے علاقے کے سب کاغذ، انگریزی و فارسی، دیکھے اور باجلاسِ کونسل حکم لکھوایا کہ اسداللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے۔ مَیں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا؟ فرمایا کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر ۱۴ یا ۱۵ دن بعد ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔ مَیں نے کہا سبحان اللہ:

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما　　　فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

سہ شنبہ ۳۔ مارچ کو بارہ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلایا، خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ لارڈ صاحب بہادر کے ہاں کا دربار اور خلعت بھی بحال ہے، انبالہ جاؤ گے تو دربار اور خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا "حضور کے قدم دیکھے، خلعت پایا، لارڈ صاحب کا حکم سن لیا، نہال ہو گیا۔ اب انبالہ کہاں جاؤں؟ جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا:

کارِ دنیا کسے تمام نکرد　　　ہرچہ گیرید مختصر گیرید

مارچ ۱۸۶۳ء

(۹)

جناب عالی

ایک شعر اُستاد کا مدت سے تحویلِ حافظہ چلا آتا ہے:

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر　　　روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

میں نے از راہِ تصرف اس شعر کی صورت بدل ڈالی:

ان دل فریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے　　　روٹھا جو بے گناہ، تو بے عذر من گیا

تم اخوان الصفا میں سے ہو۔ تمھاری آزردگی اوروں کی مہربانی سے خوشتر ہے۔ ہاں حضرت، کہیے ممتاز علی خان کی سعی بھی مشکور ہوگی؟ وہ مجموعۂ اردو چھپا یا

چھپا ہی رہے گا؟ احباب اُس کے طالب ہیں، بلکہ بعض نے طلب کو بسرحد تقاضا پہنچا دیا ہے۔

میرا حال سنیے۔ لارڈ کے ننگ صاحب نے بعدِ فتح دہلی میرا قصیدہ مجھ کو واپس بھیج دیا۔ صاحب سکرتر نے مجھ سے کہہ دیا کہ تم ایامِ غدر میں بادشاہِ باغی کے مصاحب رہے، اب گورنمنٹ کو تم سے راہ و رسم آمیزش منظور نہیں۔ ناچار چپ ہو رہا بے حیا ہوں، لارڈ ایلگن صاحب بہادر کے وقت میں پھر موافقِ معمول قصیدہ شملہ کے مقامات پر بھیج دیا۔ خلافِ تصور بحسبِ دستورِ قدیم چیف سکرتر بہادر کا خط آگیا وہی افشانی کاغذ، وہی القاب، وہی تحسینِ کلام، وہی اظہارِ خوشنودی۔ اب جو یہ امیرِ کبیر وائسرائے قلمروِ ہند ہوئے، مَیں خدمتِ دیرینہ بجا لایا۔ ۱۳۔ فروری ۱۸۶۴ء حال کو قصیدہ مع عرضداشت ارسال کیا۔ آج تک کہ ۷۔ مارچ کی ہے، جواب نہیں پایا۔ باوجود سوابقِ معرفت رسمِ قدیم کا عمل میں نہ آنا خاطر آشوب کیوں نہ ہو:

بیدل نیم ہنوز بہ بینم چہ میشود

۷۔ مارچ ۱۸۶۴ء

(۱۰)

قبلہ

میرا ایک شعر ہے:

خود پیش خود کفیل گرفتاری من است ہردم بہ پرسش دل مایوس مے رسد

یہ معاملہ میرا اور آپ کا ہے، خارج سے مسموع ہوا کہ مَیں نے جو اغلاط "برہان قاطع" کے نکال کر ایک نسخہ موسوم "بہ قاطع برہان" لکھا ہے اور ایک مجلد اس کا آپ کو بھی بھیج دیا ہے، آپ اس کی تردید میں کوئی رسالہ لکھ رہے ہیں۔

اگرچہ باور نہیں آیا، لیکن عجب آیا۔ ایک مولوی نجف علی ہیں، باوجود فضیلت علم عربی، فارسی میں ان کا نظیر نہیں۔ وہ جو ایک شخص مجہول الحال نے اہل دہلی میں سے میرے کلام کی تردید میں کتاب تصنیف کی ہے مسمیٰ "بہ محرق قاطع برہان" انھوں نے اس کی توہین اور مسودہ کی تفضیح میں دو جزو کا ایک نسخہ مختصر لکھا ہے اور ایک طالب علم مسمیٰ بہ عبدالکریم نے سعادت علی مؤلف "محرق قاطع" سے سوالات کیے ہیں اور ایک محضر اس نے بفحوائے علمائے شہر مرتب کیا ہے۔ ایک میرے دوست نے بصرف زر اس کو چھپوایا ہے۔ ایک نسخہ اس کا آج اسی خط کے ساتھ بسبیل پارسل ارسال کیا ہے۔

اس شہر میں ایک میلہ ہوتا ہے، پھول والوں کا میلہ کہلاتا ہے۔ بھادوں کے مہینے میں ہوا کرتا ہے۔ امرائے شہر سے لے کر اہل حرفہ تک قطب جاتے ہیں، دو تین ہفتے تک وہیں رہتے ہیں۔ مسلمان و ہنود دونوں فرقے کی شہر میں دکانیں بند پڑی رہتی ہیں۔ بھائی ضیا الدین خاں اور شہاب الدین خاں اور میرے دونوں لڑکے سب قطب گئے ہوئے ہیں۔ اب دیوان خانہ میں ایک میں ہوں اور ایک داروغہ اور ایک بیمار خدمتگار۔ بھائی صاحب وہاں سے آئیں گے تو مقرر آپ کو خط لکھیں گے۔ بڑے پہاڑ سے اُترے، چھوٹے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ عدم تحریر کی وجہ یہ ہے۔

سنہ ۱۸۶۴ء

(۱۱)

مَیں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں ‌ ‌ ‌ یعنی سبقِ شوق مکرّر نہ ہوا تھا

پیر و مرشد،

خفا نہیں ہوا کرتے۔ یوں سُنا مجھے باور نہ آیا، یہاں تک تو مَیں موردِ عتاب

نہیں ہو سکتا۔ جھگڑا استعجاب پر ہے، محلِ استعجاب وہ ہے کہ آپ کا دوست کہتا ہے کہ میر منشی نواب لفٹننٹ گورنر بہادر میرے شاگرد ہیں اور وہ "قاطع برہان" کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اولیا کا یہ حال ہے وائے برحالِ ہم اشقیا کے! یہ حکایت ہے شکایت نہیں۔ مَیں دنیاداری کے لباس میں فقیری کر رہا ہوں، لیکن فقیر آزاد ہوں، نہ شیاد، نہ کیاد۔ ستر برس کی عمر ہے۔ بے مبالغہ کہتا ہوں، ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے زمرۂ خاص میں سے، عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلصِ صادق الولا دیکھے: ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ، دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ تعالیٰ؛ لیکن وہ مرحوم حسنِ صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص اخلاص اس کا خاص میرے ساتھ تھا۔ اللہ اللہ دوسرا دوست خیر خواہِ خَلق، حسن و جمال چشمِ بددُور، کمالِ مہر و وفا صدق و صفا، نورٌ علیٰ نور۔ مَیں آدمی نہیں آدم شناس ہوں:

نگہم لقب ہمے زد بہ نہاں خانۂ دل　　مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیداں رفتم

غایت مہر و محبت، جس کے ملکہ کا تم کو مالک سمجھا ہوں، وہ بہ نسبت اپنے اس قدر یقین کرتا ہوں کہ پہلے دو آدمیوں کو اپنا ماتم دار سمجھا ہوا تھا۔ ایک کو تو مَیں رو لیا، اب اللہ آمین کا ایک دوست رہ گیا۔ دعائیں مانگتا ہوں کہ خدایا اس کا داغ نہ مجھے دکھائیو۔ اس کے سامنے مروں۔ میاں، میں تمھارا عاشقِ صادق ہوں۔ بھائی ابھی قطب سے نہیں آئے۔ "دافع ہذیان" کے دو مجلد اور بھیج دوں گا۔

سنہ ۱۸۶۴ء

(۱۲)

پیر و مرشد،

کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتہ میں، مولوی عبدالغفور خاں ان کا نام، اور

نسآخ ان کا تخلص ہے۔میری ان کی ملاقات نہیں۔انھوں نے اپنا دیوان چھاپے کا
موسوم بہ "دفترِ بیمثال" مجھ کو بھیجا۔اس کی رسید میں یہ خط میں نے ان کو لکھا۔چونکہ یہ خط
مجموعہ منثر اُردو کے لائق ہے، آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں۔اور ہاں حضرت وہ مجموعہ
چھَپے گا بالفتح' یا چھُپے گا بالضم؛ چھپ چکا ہو تو حق تصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں
صاحب کی ہمّت اقتضا کرے فقیر کو بھیجیے والسلام ۱۲۔

سنہ ۱۸۶۴ء

(۱۳)

قبلہ

آپ کا خط پہلا آیا اور مَیں اس کا جواب لکھنا بھول گیا۔کل دوسرا خط آیا مگر شام
کو اسی وقت پڑھ لیا۔آدمی کے حوالے کیا۔اُس نے آج صبح دم مجھ کو دیا۔مَیں جواب لکھ رہا
ہوں۔بعد اختتامِ تحریرِ معنون کر کے ڈاک میں بھجوا دوں گا۔
والیِ رام پور کو خدا سلامت رکھے۔اپریل۔مئی ان دونوں مہینوں کا روپیہ موافق دستور
قدیم آیا۔جون ماہ آیندہ کا روپیہ خدا چاہے تو آجائے۔جمعہ ۱ جولائی ہے معمول یہ ہے
کہ دسویں بارھویں کو رئیس کا خط مع ہنڈی آیا کرتا ہے۔مَیں نے قصیدہ تہنیت جلوس بھیجا[۱]

قصیدہ
۱
تجلّی کہ زموسے[۱] ربود ہوشش بہ طور — بہ شکل کلب علی خاں دگر نمود ظہور
خجستہ سرورِ سلطاں شکوہ ملا نازم — کہ رشک بر کلہش دارد افسر فغفور
ہوائے لطف وے از جان خور برد سوزش — نگاہ قہر وے از روئے مہ رباید نور
دم نگارش وصف کلام شیرینش — چو خیل مور دود بر ورق حروفِ سطور
فضائے رزمگہش شاہراہ قہر و غضب — بساطِ بزمگہش کارگاہ سور و سرور
بخوانِ شرع بہیں ہم نوالۂ شبلی — بہ بزم عشق مہیں ہم پیالۂ منصور

(باقی بر صفحہ ۲۰)

اس کا جواب آگیا۔ اب میں نظم و نثر کا مسودہ نہیں رکھتا۔ دل اس فن سے نفور ہے۔

بقیہ زدے رابطۂ حسن، ماہتاب جمال — بحسب ضابطۂ جاہ آفتاب ظہور

بحکم مرتبہ، او حاکم و فلک محکوم — زراہ قاعدۂ شرع آمرست او مامور

چو آب سیلِ روانے کہ ایستد بمغاک — بود ہمیشہ بہ فنجان وے شراب طہور

زہے وزیر و خہے شہریار دانا دل — تو شاہ کشور حسن و خرد ترا دستور

بنائے منظرِ جاہِ ترا زحل معمار — ثوابت کرۂ چرخ ہشتمیں مزدور

ثنا گر تو سکندر بہ بارجائے جلال — تفاخور تو ارسطو بدرسگاہ شعور

برائے بزم نشاط تو شمع چوں ریزند — ق — نہ پیہ گاو بکار آور ند و نے کافور

زفیض نسبت خلق تو عنبر سا[1] — بجائے موم بر آید ز خانہ زنبور

بدیں خرام و بدیں قامت و بدیں رفتار — ق — زبہر فاتحہ آئی اگر بسوئے قبور

جہانِ جانی و جانِ جہاں عجب نبود — کہ از ورود تو ہر مردہ رقصد اندر گور

بہ پیشگاہِ تو زانو ہمے زند انصاف — کہ اے بہ رحم و کرم در جہانیاں مشہور

در انتقام کشی شیوۂ کرم مگزار — برآر کامِ دلِ بدسگال از سا طور

توئی بہ فضل فزایندۂ عروج علوم — توئی بہ علم کشایندۂ عقودِ صدور

صریرِ خامۂ من بیں کہ مے رباید دل — چنانکہ از لبِ داؤدؑ استماعِ زبور

سواد صفحۂ من بیں و تابشِ معنی — عیاں چو شمع فروزندہ در شبِ دیجور

امیر زندہ دل آں والیِ ولایتِ نظم — بہ گنج خانۂ گنجہ نظامیش گنجور

غروبِ مہر و طلوعِ مہ دو ہفتہ بود — رسیدن تو بدیں اوج بعد آں مغفور[1]

چو او بزیر زمیں رفت، آں ولایت یافت — تو باش والی روئے زمیں قرون و دہور

بہ انجمن نرسیدم ز ناتوانائی — ولے بہ عرض ثنا و دعا نیم معذور

---

[1] یوسف علی خاں ولد کلب علی خاں

دو ایک دوستوں کے پاس اس کی نقل ہے ان کو اس وقت کہلا بھیجا ہے، اگر آج آ گیا، کل اور اگر کل آیا پرسوں بھیج دوں گا۔ بھائی امین الدین خاں کے اصرار سے خسرو کی غزل پر ایک غزل لکھی ہے۔ علاؤالدین خاں نے اس کی نقل ان کو بھیج دی ہے۔ میں دیوان پر نہیں چڑھاتا، مسودہ بھیجتا ہوں۔ تقدیم و تاخیر ہندسوں کے مطابق

بقیہ

بخاک پاے تو گر دستگاہ داشتمے	نبود ے بعنبم دوری در تو صبور
من آں کسم کہ ز افراطِ ورزشِ اخلاص	بغیبت است مرادعوی دوامِ حضور
توئی رحیم دل و من سقیم، دوری بہ	مباد رنجہ شوی از نظارۂ رنجور
کفے بدست تہی تر ز کیسۂ دلاک	دلے بہ سینہ بسے تنگ تر ز دیدۂ مور
کمی ز ما و کرم از شما بلا تشبیہ	ز کردگار بود روز و شب ز بندہ قصور
نظر بہ خستگی و پیری و تہیدستی	قبول کردن تسلیم من خوش است از دور
شعار غالب آزادہ جز دعا نبود	کہ باد سعی دعا گوے در دعا مشکور
بدہر تا بود آئین کہ در نوا آرند	رباب و بربط و قانون و نے بمحفل سور
بہ بزم عیش تو ناہید باد زمزمہ سنج	نسیم عطر فروش از شمیم طرۂ حور

محب ز لطف تو بالندہ چوں نوا از ساز
عدو ز بیم تو نالندہ چوں خر طنبور

غزل: ۱۷

ہم انا اللہ خواں درختے را بگفتار آورد	ہم انا الحق گوی مردے را سر دار آورد
اے کہ پنداری کہ ناچار است گردوں در روش	نیست ناچار آنکہ گردوں را برفتار آورد
نکتۂ داریم و بابا یاراں، نے گوئیم فاش	طالبِ دیدار باید تاب دیدار آورد
آں کند قطع بیاباں، ایں شگافد مغز کوہ	عشق ہر یک را بطرز خاص در کار آورد

(بقیہ غزل بر صفحہ

ملحوظ رہے۔ گرمی کی شدت سے حواس بجا نہیں، معہذا امراض جسمانی و آلام روحانی۔

۷۔ جولائی سنہ ۱۸۶۵ء

(۱۴)

بندۂ گنا ہگار، شرمسار عرض کرتا ہے کہ پرسوں غازی آباد کا اٹھا ہوا گیارہ بجے اپنے گھر پر مثل بلائے ناگہانی نازل ہوا ہوں:

باید کہ کنم ہزار نفریں بر خویش — اما بہ زبانِ جادۂ راہِ وطن

خواجہ[1] صاحب کی رحلت کا اندوہ، بقدر قرب و قرابت آپ کو اور باندازہ مہر و محبت مجھ کو۔ وہ مغفور میرا قدردان اور مجھ پر مہربان تھا۔ حق تعالیٰ اس کو اعلیٰ علیین میں بسبیل دوام قیام دے۔ رام پور ہی میں تھا کہ "اودھ اخبار" میں حضرت کی غزل نظر فروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے! ابداع اس کو کہتے ہیں جدت طرز اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ نوایان ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروے کار لائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور میرے اور دکھنی صاحب "برہان قاطع" کے جھگڑے میں بخلاف اور فارسی دانوں کے توفیق انصاف عطا کرے۔ لو اب

بقیہ وغیرہ

جذب شوقش بیں کہ در ہنگام برگشتن ز دیر — در تغافلے خویشتن بت را برفتار آورد
دانہ ہا چوں ریزد از تسبیح تاری بیش نیست — ایں مشعبد دہر گاہ از سبحہ زنار آورد
آہ ما را بیں کہ نارد از دل سختش خبر — باد را نازم کہ ابر از سوے کہسار آورد
نزد ما حیف ست گو نزد زلیخا میل باش — جذبۂ کز چاہ یوسفؑ را بہ بازار آورد
ہر انارے را کہ افشاریم از وے خوں چکد — ہر نہالے را کہ بنشانیم دل بار آورد

نیست چوں در منطقش جز ذکر شاہد حرف و صوت
شاہدے باید کہ غالبؔ را بگفتار آورد

[1] ملاحظہ ہو خط ۱۵

اس کا جواب جلد بھیجو تا یہ طریقہ مسلسل ہو جائے[۱]۔
۱۰-جنوری ۱۸۶۶ء

(۱۵)

مولانا، بندگی۔

آج صبح کے وقت شوقِ دیدار میں بے اختیار، نہ ریل، نہ ڈاک، توسنِ ہمت پر سوار چل دیا ہوں۔ جانتا ہوں کہ تم تک پہنچ جاؤں گا، مگر یہ نہیں جانتا کہ کہاں پہنچوں گا۔ اتنا بیخود ہوں کہ جب تک تم جواب نہ دو گے، مَیں نہ جانوں گا کہ کہاں

---

[۱] جس غزل کا حوالہ دیا وہ ذیل میں درج ہے:

چشم کہ باز شد زخواب؟ فتنہ از دو بجا پَر سوست — پردہ ز رخ کہ برکشاد؟ مہر ز شرم زرد روست
رخت خرد بہ آب رفت عارضِ شرمگیں کہ شست؟ — غرقۂ آبِ حیرت است آئینہ با کہ روبروست؟
جامہ کہ کرد زیبِ تن؟ صبح درید پیرہن — بندِ قبا کہ بستہ است؟ نکہتِ گل بہ بندِ اوست
غازہ برخ کہ برکشید؟ رنگ بروئے گل شکست — ابروئے کیست وسمہ تاب؟ گردنِ خلق تیغ جوست
دست کہ در حنا گرفت؟ لالہ تر بہ خوں نشست — چشم کہ مستِ سرمہ گشت؟ ناطقہ سرمہ در گلوست
جامِ صبوحی کہ زد؟ شیشہ بسجدہ مے رود — مے ز لب کہ کام یافت؟ جوشِ نشاط در سبوست
چہرہ ز مے کہ برفروخت؟ نشاہ شوق شد بلند — زلف کہ بوے برفشاند؟ موجِ نسیم مشکبوست
تیغ نگہ کہ آب داد؟ گشتہ فگار سینہ ہا — نوکِ مژہ کہ تیز کرد؟ دامنِ زخم بے رفوست
غنچہ ز خندہ لب بہ لب رنگ تبسم کہ دید؟ — در گہر آبرو نہ ماند لعل کہ گرمِ گفتگوست؟
طرفِ کلہ کہ برشکست؟ شیشۂ دل شکستہ شد — قامتِ خود کہ راست کرد؟ نخلِ مراد در نموست
موئے کمر کہ تاب داد؟ رشتۂ جاں زہم گسیخت — دامنِ ناز را کہ ہشت؟ خاکِ زمیں بہ آبروست
بر سرِ زیں کہ برنشست؟ رفتہ ز کف عنانِ صبر — سوی چمن کہ میرود؟ بادِ صبا بہ رفت و روست
بخت کجاست بیخبر تا برکاب او دوم — بر سرِ رہ نشستہ ام نیم نگاہم آرزوست

پہنچا اور کب پہنچا۔

آپ کا پہلا خط رام پور سے دلّی آیا، مَیں راہ میں تھا۔ پھر دلّی سے خط رام پور پہنچا، مَیں وہاں بھی نہ تھا۔ خط دِلّی روانہ ہوُا۔ اب کئی دن ہوے کہ مَیں نے ڈاک سے پایا۔ اس حال میں کہ مَیں بیمار تھا، معہذا جاڑے کی شدّت، مہاوٹ کا مہینہ، دُھوپ کا پتہ نہیں، پردے پھٹے ہوئے، نشیمن تاریک۔ آج نیّرِ اعظم کی صورت نظر آئی۔ دھوپ میں بیٹھا ہوں، خط لکھ رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کیا لکھوں؟ اس خط کے مضامین اندوہ فزا نے دل کو مضمحل کر دیا۔ جانتا تھا کہ خواجہ صاحب مغفور تمھارے ماموں ہیں[۱] نگران کے اور تمھارے معاملات حمر وولا جیسے کہ تمھاری تحریر سے اب معلوم ہوئے، میرے دل نشین نہ تھے۔ ایسے محب کا فراق اور پھر بقید دوم کیوں کر جاں گزانہ ہو۔ حق تعالیٰ ان کو بخشے اور تم کو صبر دے۔

حضرت مَیں بھی اب چراغ سحری ہوں۔ رجب ۱۲۸۲ھ حال کی آٹھویں تاریخ سے اکہتّرواں سال شروع ہو گیا۔ طاقت سلب، حواس مفقود، امراض مستولی۔ بقول نظامی:

یکے مردہ شخصم بمردی رواں

آج مَیں اور بھی باتیں کرتا مگر میرا خاص تراش آ گیا۔ مہینے بھر سے حجامت نہیں بنوائی۔ خط لپیٹ کر ڈاک میں بھیجتا ہوں اور خط بنواتا ہوں۔[۲]

(۱۶)

قبلہ

پیری و صد عیب۔ ساتویں دھاکے کے مہینے گن رہا ہوں۔ قولنج آگے دَوری

۱؎ یہ اشارہ خواجہ غلام غوث خاں کے ماموں خان بہادر سید محمد خاں کی وفات کی طرف ہے۔

۲؎ یہ خط اوائل ۱۸۶۶ء کا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں دوسرے سفر رام پور کا ذکر ہے۔

تھا، اب دائمی ہوگیا۔ مہینہ بھر میں پانچ سات بار فضول مجتمعہ دفع ہو جاتے ہیں اور یہی منشاءِ حیات ہے۔ غذا کم ہوتے ہوتے اگر معدوم نہ کہو تو بمنزلہ مفقود کہو۔ پھر گرمی نے مار ڈالا۔ ایک حرارت غریبہ جگر میں پاتا ہوں۔ اگرچہ جرعہ جرعہ پیتا ہوں، مگر صبح سے سوتے وقت تک نہیں جانتا کہ کتنا پانی پی جاتا ہوں۔

میرے ایک رشتہ کے بھتیجے نے "بوستان خیال" کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک دو ورقہ اس کا بصورت پارسل بلکہ بہ ہیئت خط بھیجتا ہوں۔ آپ کا مقصود دیباچہ ہے سو نقل کر لیجئے۔ میرا مدعا اس دو ورقے کے ارسال سے یہ ہے کہ اگر آپ کے پسند آوے یا اور اشخاص خرید کرنا چاہیں تو چھ روپے قیمت اور محصول بہ ذمہ خریدار ہے۔

۱۸۶۶ء

(۱۷)

قبلہ

میں نہیں جانتا کہ ان روزوں میں بقول ہندی اختر شناسوں کے کونسی کھوٹی گرہ آئی ہوئی ہے کہ ہر طرف سے رنج و زحمت کا ہجوم ہے۔ مولوی صاحب سے میری ایک ملاقات ہوئی، جب وہ دلی آئے تھے اور میر خیراتی کے گھر اترے ہوئے تھے۔ شرفا میں تعارف بنائے محبت و مودت ہے، چہ جائے آنکہ معانقہ اور مکالمہ اور مشاعرہ واقع ہوا ہو۔ روز ملاقات سے اس دن تک کہ حضرت دکن کو روانہ ہوں کوئی امر ایسا کہ باعث ناخوشی کا ہو، درمیان نہیں آیا اور میرے اس قول کی اس راہ سے کہ مولوی صاحب آپ کے ہمنشیں و ہمدم تھے اور مجھ میں آپ میں پیوند دلاے روحانی متحقق ہے، آپ بھی گواہ ہو سکتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مجھ میں ان میں رنج پیدا ہوتا تو آپ بہت جلد اصلاح بین الذاتین کی طرف متوجہ ہوتے۔ اب سنئے

۱؎ یعنی عود ہندی کے لئے جو زیر ترتیب تھی

حال منشی حبیب اللہ کا ، مَیں نے اُن کو دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ تین چار برس ہُوے کہ ناگاہ ایک خط حیدر آباد سے آیا ، اس میں دو غزلیں۔ خط کا مضمون یہ کہ میں مختار الملک کے دفتر میں نوکر ہوں۔ آپ کا تلمذ اختیار کرتا ہوں۔ ان دونوں غزلوں کو اصلاح دیجیے۔ اس امر کے وہ بادی نہیں ، بریلی اور لکھنؤ اور کلکتہ اور بمبئی اور سورت سے اکثر حضرات نظم و نثر فارسی اور ہندی بھیجتے رہتے ہیں۔ مَیں خدمت بجا لاتا ہوں اور وہ صاحب میرے حک و اصلاح کو مانتے ہیں۔ کلام کا حسن و قبح میری نظر میں رہتا ہے اور ہر ایک کا پایہ اور دستگاہ ' فن شعر میں ' معلوم ہو جاتا ہے۔ عادات و عندیات عدم ملاقات ظاہری کے سبب میں کیا جانوں۔ آمدم بر سر مدعا۔ منشی حبیب اللہ ذکا کے اشعار آتے رہے اور مَیں اصلاح دے کر بھیجتا رہا۔ بعد وار د ہونے مولوی صاحب کے ایک غزل ان کی آئی اور اُنھوں نے یہ لکھا کہ مولوی غلام امام شہید[1] اکبر آبادی کی غزل پر یہ غزل لکھ کر بھیجتا ہوں۔ مَیں نے حسب معمول غزل کو اصلاح دے کر بھیجا اور یہ لکھا کہ مولانا شہید اکبر آباد کے نہیں لکھنؤ اور الہ آباد کے ہیں۔ اس کلمہ سے زیادہ کوئی بات مَیں نے نہیں لکھی۔ اس میں سے توہین کے معنے مستنبط ہوں تو مَیں ان کا مستہن[2] سہی۔ اب مَیں نہیں جانتا کہ منشی صاحب نے مولوی صاحب سے کیا کہا اور مولوی صاحب نے آپ کو کیا لکھا۔

عہ۱ مولوی غلام امام شہید (نواح لکھنؤ) کے تھے۔ مولوی حیدر علی سے علوم متداولہ پڑھے۔ فن شعر میں قتیل، مصحفی اور غلام مینا ساحر سے مشورہ لیا۔ حیدر آباد سے محی الدولہ نے ایک ہزار روپے زادراہ دے کر بلایا۔ حج کے لیے گئے تو نواب سر سالار جنگ اور راجا گردھاری پرشاد نے کشادہ دلی سے امداد دی۔ نواب صدیق حسن خاں نے اپنے تذکرۂ شعرا میں ان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس خط میں مولوی صاحب سے شہید ہی مراد ہیں۔

عہ۲ توہین کرنے والا

حضرت پیر و مرشد

اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں صاحب سے میری ملاقات ہے اور وہ میرے دوست ہیں۔ یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ میں صاحب فراش ہوں، اٹھنا بیٹھنا ناممکن ہے، خطوط لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ اس حال میں دیباچہ کیا لکھوں؟ یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ تفتہ کو میں نے خط نہیں لکھا۔ اشعار اُن کے آئے اصلاح دے دی، منشاء اصلاح جا بجا حاشیے پر لکھ دیا۔ کل جو عنایت نامہ آیا اُس میں بھی دیباچہ کا اشارہ اور تفتہ کے خطوط کا حکم مندرج پایا۔ ناچار تحریر سابق کا اعادہ کر کے حکم بجا لایا۔

ناظرین "قاطع برہان" پر روشن ہو گا کہ "نامراد" اور "بے مراد" کا ذکر مبنی اس پر ہے کہ عبدالواسع ہانسوی "بے مراد" کو صحیح اور "نامراد" کو غلط لکھتا ہے۔ میں لکھتا ہوں کہ ترکیبیں دونوں صحیح لیکن "بے مراد" غنی کو کہتے ہیں اور "نامراد" محتاج کو اب آپ کے نزدیک اگر ان دونوں کا محل استعمال ایک ہی ہو تو میرا مدعائے اصلی یعنی "نامراد" کی ترکیب کا علی الرغم عبدالواسع کے صحیح ہونا فوت نہیں۔ شعر میرزا صائب:

نامرادی زندگی برخویش آساں کردن است　　ترک جمعیت دلِ خود را بساماں کردن است

یہاں "نامرادی" "بے مرادی" کے معنے کیوں کر دے گی؟ اغنیا خواہ اہل توکل، خواہ اہل تمول۔ متمولین پر کبھی کام آسان نہیں ہوتا بلکہ مفلسوں سے زیادہ ان پر مشکلیں ہیں۔ رہے اہل توکل ان کی صفتیں اور ہیں۔ وہ اہل اللہ ہیں، مقربان بارگاہ کبریا ہیں۔ دنیا پر پشت پا مارے ہوئے ہیں۔ کام اُن پر کب مشکل تھا کہ اُنھوں نے اُس کو آسان کر دیا؟ "نامراد" صیغہ مفرد ہے مساکین کا، اصناف مساکین کی شرح ضرور نہیں سختی کشی، بے نوائی، تہیدستی، گدائی، یہ اوصاف ہیں مساکین کے۔ ان صفات میں سے ایک صفت جس میں پائی جائے وہ مسکین، وہ نامراد۔ البتہ مساکین پر نہ ایک کام بلکہ سب

کام آسان ہیں۔ نہ پاس ناموس و عزت، نہ حبِ جاہ و مکنت۔ نہ کسی کے مدعی، نہ کسی کے مدعا علیہ۔ دن رات میں دو بار روٹی ملی بہت خوش، ایک بار ملی بہ ہر حال خوش۔ خدا کے واسطے مولانا صاحب کے شعر میں سے نامراد بمعنی کسے کہ ہیچ مراد نداشتہ باشد کیوں کر ثابت ہوتا ہے؟ مساکین کی زندگی جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں آسان گزرتی ہے یا اغنیا کی؟ رہا مولوی معنوی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر:

عاقلاں از بے مرادیہائے خویش   باخبر گشتند از مولائے خویش

میں نے مثنوی کے ایک نسخہ میں عاقلاں کی جگہ عاشقاں دیکھا ہے۔ بہ ہر صورت معنی یہ ہیں کہ عشاق یا عقلا بعد ریاضتِ شاقہ ماسوائے اللہ سے اعراض کر کے بے مراد اور بے مدعا ہو گئے۔ یہ پایۂ تسلیم و رضا ہے البتہ اس رتبے کے آدمی کو خدا سے لگاؤ پیدا ہوگا:

باخبر گشتند از مولائے خویش

یہاں بھی "بے مرادی" سے "نامرادی" کے معنے نہیں لیے جاتے مگر ہاں:

بے مرادی مومناں از نیک و بد

دوسرا مصرع

در بکلی بے مرادت داشتی

ان دونوں مصرعوں میں "نامراد" اور "بے مراد" کے معنے میں خلط واقع ہو گیا ہے۔ خیر "بے مراد" اور "نامراد" ایک سہی۔ ہر چند دوسرے مصرعِ مولوی میں بے مراد کے معنے بے حاجت کے درست ہوتے ہیں مگر:

من کہ رندم شیوۂ من نیست بحث

زیادہ تکرار کیوں کروں؟ معہذا مصرع اول کی کچھ توجیہ بھی نہیں کر سکتا۔ "نامراد" کی ترکیب کی صحت علی الرغم عبدالواسع ثابت ہو گئی۔ فثبت المدعا۔ کمال یہ کہ مانند

"ناچار" و "بیچارہ" اور "نا انصاف" اور "بے انصاف" کے "نامراد" و "بے مراد" کا بھی مورد استعمال مشترک رہا۔ والسلام ۱۲۔

(۱۹)

بندہ پرور،

اگر ایک بندۂ قدیم کہ عمر بھر فرماں پذیر رہا ہو، بڑھاپے میں ایک حکم بجا نہ لائے تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعۂ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچہ پر موقوف ہے تو اُس مجموعہ کا چھپ جانا، 'بالفتح' میں نہیں چاہتا۔ بلکہ چُھپ جانا، 'بالضم' چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

رسم است کہ مالکانِ تحریر آزاد کنند بندۂ پیر

آپ بھی اسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں، پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ حضرت وہ شعر بنگالی زبان کا و ۱۸۲۹ء میں ضیافتِ طبعِ احباب کے واسطے کلکتہ سے ارمغان لایا ہوں صحیح یوں ہے:

تم کہے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں
قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائے نہیں

والسلام بالوف الاحترام ۱۲۔
۱۸۶۶ء

(۲۰)

قبلہ

کل خط آیا، آج جواب لکھتا ہوں۔ پہلے آپ کا ایک فقرہ لکھ کر اتنا ہنسوں کہ پیٹ میں بل پڑ جائیں اور آنکھ سے آنسو نکل آئیں۔ فقرہ: "بڑھاپے میں کیا جانیے کہاں کی حرارت مزاج میں آگئی ہے" فقط۔ کیوں صاحب تم نے بڈھوں میں اپنا

نام لکھوایا تو مجھ کو لازم ہے، مَیں اپنے کو اموات میں گنوں۔ تمھاری عمر میرے نزدیک پچاس سے متجاوز نہ ہوگی، اگر تجاوز کیا ہوگا تو دو تین برس سے وہ تجاوز زیادہ نہ ہوگا۔ بھائی ضیاءالدین خاں اور تم ہم عمر ہو۔ وہ کچھ کم پچاس، تم کچھ اُوپر پچاس۔ ابھی تم دونوں صاحبوں کو ایک سو بیس برس میں سے ستر برس یا کچھ کم ستر برس باقی ہیں ۱۲۔

"بنا بہ آب رسیدن" لازمی اور "بنا بہ آب رساندن" متعدی بہ اجماعِ جمہور اضداد میں سے ہے، ہم بمعنی استحکام و ہم بمعنی انہدام۔ در صورت استحکام تہوکا گہرا کھودنا ملحوظ ہے اور در صورت انہدام لطمۂ امواجِ سیلاب مدنظر ہے۔ آپ کے لکھے ہوئے دونوں شعر مفید معنی خرابی ہیں۔ صائب:

بنائے عمر مسیح و خضر بہ آب رسید

یعنی ویران ہوگئی، ڈھے گئی، حال آنکہ وہ یقیناً جاودانی تھی:

ہنوز تشنۂ خون است تیغ مژگانش

باآنکہ تیغ مژہ نے دو زندۂ جاوید کو مارا مگر اب تک تشنۂ خون ہے۔ تشنہ بمعنی مشتاق اور خون بمعنے قتل اور بنائے عمر بہ آب رسیدن استعارۂ اہلاک:

ہزار میکدہ را محتسب بہ آب رساند　　بنائے صومعۂ شیخ ہمچناں برپاست

بنائے میکدہ، غلط ہزار میکدہ صحیح ہے۔ کلیم کے دیوان میں موجود ہے۔ بہ معنی استحکام نعمت خان عالی کہتا ہے:

نیست محکم گر رسد بنیادِ دنیا تا بہ آب　　چوں حباب ایں خانہ بے بنیاد مے سازیم ما[۱]

صائب کہتا ہے:

چگونہ شمع تجلی ز رشک نہ گدازد　　رخِ تو خانۂ آئینہ را بہ آب رساند

بر نون موقوف ۱۲۔

---

[۱] چھپا ہوا ہے "مے دانیم ما" تھا لیکن عالی کی پوری غزل کی ردیف "مے سازیم ما" ہے۔

غالبؔ کہتا ہے کہ اساتذہ کے کلام کے مشاہدے میں اگر تو غل رہے، تو ہزارہا بات نئی معلوم ہوتی ہے۔ مَیں نے سات شعر امیر خسروؔ کی غزل پر لکھ کر ایک مطرب کو دیے، وہ مجلسوں میں گانے لگا۔ اکبرآباد و لکھنؤ تک مشہور ہوئے۔ وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے:

از جسم بجاں نقاب تا کے   ایں گنج دریں خراب تا کے

ایک صاحب آگرے میں اور ایک صاحب لکھنؤ میں معترض ہوئے کہ "گنج در خرابہ باید نہ در خراب" ہرچند کہا کہ "خرابہ" مزید علیہ اصل لغت "خراب" عربی الاصل، بمعنے ویران و ویرانہ ہے، جس کی ہندی اوجڑ۔ معترض، مصر رہا۔ صائب کے دیوان میں سے یہ مطلع نکلا:

بہ فکر دل نہ فتادی بہیچ باب دریغ   بہ گنج راہ نہ بردی دریں خراب دریغ

سنہ ۱۸۶۶ء

(۲۱)

قبلہ

آج تیسرا دن ہے کہ میں "بنا بہ آب رسیدن" و "بآب رساندن" کی حقیقت باستنادِ اشعارِ اساتذہ لکھ کر بسبیل ڈاک بھیج چکا ہوں۔ آج اس وقت بھائی ضیاالدین خاں صاحب آئے اور اس امرِ خاص میں کلام کے بادی ہوئے۔ میری تقریر سن کر کہنے لگے کہ "آب در بنا رسیدن" و "آب در بنا رساندن" کے باب میں متردد ہیں کہ آیا یہ ترکیب جائز ہے یا نہیں؛ اب میں متنبہ ہوا کہ واقعی جو مَیں نے لکھا وہ سوال دیگر، جواب دیگر تھا۔ ستر برس کا پیر خرف، حواس معرضِ تلف۔ اگرچہ سوال کو غلط سمجھا لیکن جواب غلط نہیں لکھا۔ رسیدن بنا بآب ہم بمعنے استحکام بنا و ہم بمعنے انہدام بنا، درست فقط۔

اب "آب در بنا رسیدن" و "رساندن" کی کیفیت سُنیے: فقیر نے اساتذہ کے کلام میں کہیں یہ ترکیب نہیں دیکھی، پس مَیں اس کی صحت اور غلطی میں کلام نہیں کر سکتا۔ جانب غلطی میرے نزدیک راجح ہے۔ آپ جب تک کلام اہل زبان میں نہ دیکھ لیں۔ اُس کو جائز نہ جانیے گا، مگر کلام سعدیؔ و نظامیؔ و حزیںؔ اور اُن کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے، نہ آرزوؔ اور واقفؔ اور قتیلؔ وغیرہم کا۔

میرا ایک مطلع ہے:

از جسم بجاں نقاب تا کے این گنج دریں خراب تا کے

ایک گروہ معارض ہوا کہ "گنج" کو "خرابہ" کہو، نہ "خراب"۔ میں متحیر کہ یارب کس سے کہوں، "خرابہ" مزید علیہِ "خراب" ہے، مثل "ویران و ویرانہ" و "موج و موجہ" الحاق ہائے ہوز سے لغت دوسرا نہیں پیدا ہوتا۔ بارے صائبؔ کے دیوان میں ایک مطلع نظر آیا:

نگرد دل نہ فتادی بہیچ باب دریغ بگنج راہ نہ بردی دریں خراب دریغ

یہ مطلع لکھ کر معترض صاحبوں کو بھیج دیا کہ غالبؔ کو دردسر نہ دیجیے، جو پوچھنا ہو وہ صائبؔ سے پوچھ لیجیے۔ عارف علی شاہ خراسانی نے اسی مطلع پر:

از جسم بجاں نقاب تا کے این گنج دریں خراب تا کے

تین اعتراض کیے تھے: پہلا نقاب کے ساتھ عارض و رخ کا ذکر بھی ضرور تھا، وہ نہیں ہے۔ دوسرا گنج تو ویرانے ہی میں ہوتا ہے، پھر اس پر تاسف کیا، جو کہتے ہیں "تا کے"؟ تیسرا "ویرانہ" کو "خرابہ" کہتے ہیں، نہ "خراب" اور ان اعتراضوں کے بعد انھوں نے دخل کیا تھا:

از جسم بجاں حجاب تا کے گل بر رُخ آفتاب تا کے

سنہ ۱۸۶۶ء

(۲۲)

قبلہ،

دیکھیے، ہم عارف ہیں۔ درود نامہ سے پہلے جواب نامہ لکھتے ہیں، دن بھول گیا ہوں، غالب ہے کہ آج تیسرا دن ہو۔ صبح کو میں نے "آب در بنا رسیدن" کی بحث میں خلاصۂ تحقیق لکھ کر ارسال کیا۔ اُسی دن شام کو آپ کا خط آیا بقیہ جواب اب لکھتا ہوں۔

نقاب اُس شعر میں بمعنے حائل ہے، حول کو وجہ و رُخ کی خصوصیت نہیں۔ دو چیزوں کے بیچ میں جو شے آجائے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جو چیز ایک چیز کی مانع نظارہ ہے، وہ نقاب ہے۔ اُس شے نامرئی کا رخ بمناسب نقاب مقدر ہے اور یہ تقدیر جائز اور بلیغ ہے۔ حجاب کا یہاں اوپری یعنی بے محل اور نا ملائم ہونا بشرطِ عقل سلیم و طبع لطیف ظاہر ہے۔ گل خاک بآب آمیختہ کو کہتے ہیں وہ رُخ آفتاب تک کہاں پہنچے۔ ہاں گرد و غبار میں آفتاب چھپ جاتا ہے اُس کا استعمال از روے مجاز جائز ہے۔

"گنج در ویرانہ تاکے" یہ بہت لطیف بات ہے، یعنی افسوس کیا جاتا ہے اُس گنج کے بیکار رہنے کا۔ گنج سے غرض یہی تو نہیں کہ جنگل میں مدفون رہے۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ مدفن سے نکلے اور صرف ہو۔ لوگ اُس کے وجود سے تمتع پائیں۔

یہاں ایک اور دقیقہ ہے کہ اس شعر میں گنج مشبہ بہ اور روح انسانی مشبہ ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ روح کا تعلق جسم سے جاودانی نہیں، پس کیا قباحت ہے اگر ایک غمزدہ و ستم زدہ قطع تعلق روح کا منتظر اور مشتاق ہو۔ مثلاً ایک میعادی محبوس حسرت مندانہ کہے کہ الٰہی وہ دن کب آئے گا کہ میں قید سے نجات پاؤں؟ کب تک

سر دُک کاٹوں ، کب تک رنج اُٹھاؤں ؟ فاخر مکین ایک شاعر تھا۔ شجاع الدولہ و آصف الدولہ کے عہد میں ، اُس نے سعدی و نظامی و حزیں کے اشعار کو اصلاحیں دی ہیں جب ایک ہندوستانی بے علم ، تنک مایہ ، اساتذۂ نامی عجم کے کلام کو اصلاح دے ، اگر ایک عالم خراسانی نے ایک ہندی کے مطلع میں تصرف کیا تو کیا قباحت لازم آئی ؟ خدا کا شکر کہ مجھ کو ستر برس کی عمر میں پچاس برس کی مشق کے بعد اُستاد میسّر آیا۔

سنہ ۱۸۶۶ء

(۲۳)

جناب عالی

کل میرے شفیق مکرم منشی نواب جان کلبۂ احزان میں تشریف لائے ، آپ کا سلام کہا معلوم ہوا کہ خواجہ صدرالدین صاحب لشکر کے ساتھ گئے ہیں اور آپ یہیں ہیں۔ اس فصل ہیں کہ ابھی سے رات دن آگ برستی ہے ، اچھا ہوا کہ زحمتِ سفر نہ کھینچی۔ اجی حضرت یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں ؟ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ اُن سے کہیں ، مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں وہ سب یا اُن سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو :

تم سلامت رہو قیامت تک

۲۴

پیر و مرشد

" سہل ممتنع " میں کسرۂ لام توصیفی ہے۔ سہل موصوف اور ممتنع صفت۔ اگرچہ

لے مشقتیں اٹھاؤں۔

بحسب ضرورت وزن کسرۂ لام مشبع ہوسکتا ہے لیکن مخل فصاحت ہے اور لام دنو
توخود سراسر قباحت ہے۔ "سہل ممتنع" اُس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان
نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہوسکے۔ بالجملہ سہل ممتنع کمال حسن کلام ہے اور بلاغت
کی نہایت ہے۔ ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔ شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صفت
پر مشتمل ہیں اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوے کی رعایت منظور
رکھتے ہیں۔ خودستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع
اکثر پائے گا۔

ہے سہل ممتنع یہ کلام ادق مرا　　برسوں پڑھے تو یاد نہ ہووے سبق ہر

یہ مصرع حیرت آور ہے۔ کلام ادق سہل ممتنع کے منافی ہے۔ پھر یاد نہ ہونا اور حافظے پر
نہ چڑھ جانا ہرگز سہل ممتنع کی صفت نہیں ہوسکتی۔ "کلام ادق" جس کا حفظ دشوار ہو شاید
کوئی قسم اقسام کلام میں سے ہو۔ ہاں کلام ادق کلام مغلق کو کہتے ہیں۔ سو کلام مغلق اور
کلام سہل ممتنع ضد یک دیگر ہے۔ مغلق اور ادق سہل ممتنع اور سہل ممتنع مغلق اور ادق
کیوں کر ہوسکے گا۔ اور حافظے میں محفوظ رہنا کلام مغلق و ادق کی صفت کیوں کر پڑے گی؟
ہاں مغلق عسیر الفہم ہوگا، پڑھا نہ جائے گا۔ معنی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ سہل ممتنع کی صفت وہ تھی
جو فقیر اوپر لکھ آیا، اس شعر سے اسے کچھ علاقہ نہیں، ختم۔

آب در بنا رسیدن بمعنے خراب بنیاد" قیاسی ہے۔ اساتذہ کے کلام میں میں نے نہیں
دیکھا۔ اگر آیا ہو تو درست ہے۔ ہاں بآب رسانیدن بنا کہ بظاہر آب در بنا رسیدن کا
متعدی منہ ہے، بلغا کے کلام میں آیا ہے۔ لیکن اضداد میں سے ہے۔ بمعنے ویرانیِ بنا
مستعمل اور ہم بمعنے استحکام بنا۔ اگر اس کا لازم ڈھونڈیے تو رسیدن بنا بہ آب ہے
نہ رسیدن آب در بنا جیسا کہ نعمت خان عالی کہتا ہے:

نیست محکم گر رسد بنیاد دنیا تا بہ آب　　چوں حباب ایں خانہ بے بنیاد مے سازیم ما

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسیدن بنا تا بآب موجب استحکام ہے اور شاعر باوجود دلیل استحکام بنا کو نااستوار چاہتا ہے۔

صائب کہتا ہے:

چگونہ شمع تجلی ز رشک نگدازد ۔۔۔ رخ تو خانۂ آئینہ را بآب رساند

حاجی محمد جان قدسی:

بگوش عطایش رساند ایں خطاب ۔۔۔ کہ بنیاد کاں را رساند بآب

یہ دونوں شعر مفید معنی ویرانی ہیں۔ قصہ مختصر "بآب رسیدن بنا خرابی خانہ وبآب رساندن" متعدی آں و رسیدن آب در بنا نامسموع۔ میں ابھی بیمار ہوں اور بیمار کے واسطے انجام کو غسل صحت ہے یا غسل میت والسلام ۱۲۔

(۲۵)

قبلہ

آپ بیشک ولی صاحب کرامت ہیں۔ کم و بیش ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ ایک امر جدید مقتضی اس کا ہوا کہ آپ کو اس کی اطلاع دوں۔ خانہ کاہلی خراب، آج لکھوں، کل لکھوں اب کون لکھے، کل صبح لکھوں گا، صبح ہوئی غالب اس وقت نہ لکھ، سہ پہر کو لکھیو۔ آج دو شنبہ ۲۳۔ جولائی کے بارہ پر دو بجے ہرکارے نے آپ کا خط دیا پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا اور اسی طرح جواب لکھا۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ رہا تھا مگر بھجوا دیا۔ کل روانہ ہو رہے گا۔ آپ کو معلوم رہے کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفےٰ خاں حسرتی کو کبھی اردو خط نہیں لکھا[۱]۔ ذکا کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں منشاء اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے:

کہار آیا، خط لایا، آم پہنچے۔ کچھ بانٹے، کچھ کھائے۔ بچوں کو دعا۔ بچوں کی

۱؎ یہ صحیح نہیں ذکا کے نام کئی خط موجود ہیں۔ اور ایک خط مصطفےٰ خاں کے نام بھی ہے۔

بندگی[1] مولوی الطاف حسین[2] صاحب کو سلام۔

یہ تحریر اس ہفتے میں گئی ہے۔ غرض کہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں یہ لائقِ شمولِ مجموعۂ نثر اردو کہاں ہے؟ یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثر یں کو آپ خود نہ درج کریں گے۔

کتاب کے باب میں سرمد کی رباعی کا شعر اخیر لکھ دینا کافی ہے۔

عالم ہمہ مرآت جمال ازلی ست　　　می باید دید و دم نمی باید زد

"بوستان خیال" کا ترجمہ موسوم "بہ حدائق الانظار" معرض طبع میں ہے۔ اگر آپ یا آپ کا کوئی دوست خریدار ہو تو جتنی مجلد فرمایئے، اس قدر بھجوا دوں۔ چھ روپے مع محصول ڈاک قیمت ہے۔ اسی مطبع میں جس میں "حدائق الانظار" انطباع ہوا ہے، اخبار بھی چھاپا جاتا ہے + اب کے ہفتے کا دو ورقہ بھجوا دیا جائے گا۔ بشرط پسند آپ توقیع خریداری لکھ بھیجئے گا۔

جناب کیمس صاحب بہادر افسر مدارس غرب و شمال کا، باوجود عدم تعارف، خط مجھ کو آیا۔ کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا۔ اس کا جواب لکھ بھیجا۔ نظم و نثر اُردو طلب کی تھی۔ مجموعہ نظم بھیج دیا۔ نثر کے باب میں تمہارا نام نہیں لکھا، مگر یہ لکھا کہ مطبع الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع و حصول اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا۔ زیادہ حد ادب، نامہ جواب طلب۔

انور الدولہ شفق

انوار الدولہ سعید الملک نواب سعد اللہ خاں بہادر صولت جنگ تخلص بہ شفق رئیس کدورا کالپی (یو۔پی)

نواب نظام الملک آصف جاہ اول دربار دہلی کے ناہنجار اوضاع سے تنگ

---

[1] مطلب یہ ہے کہ آپ کے بچوں کو دعا۔ میرے بچوں کی بندگی۔ [2] یعنی خواجہ حالی جو اس زمانہ میں شیفتہ کے مصاحب تھے۔

آکر دکن چلے گئے، تو اپنے بڑے بیٹے کو غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کا موروثی خطاب دلاکر نیابت کے لیے دہلی میں چھوڑ گئے تھے۔ ۱۱۶۱ھ میں نظام الملک فوت ہوئے تو غازی الدین خاں نے دکن کی ریاست لینی چاہی۔ دربار سے فرمان لے کر چلا۔ مرہٹوں سے امداد مانگی اور کئی علاقوں کے وثیقے ان کے نام لکھ دیے۔ اورنگ آباد پہنچ کر چند روز بعد وفات پائی۔

اس کا بیٹا میر شہاب الدین دہلی میں نائب تھا۔ اسے امیر الامرا عماد الملک نواب غازی الدین خاں بہادر کا خطاب ملا اور وہ وزیر اعظم بن گیا۔ یہ عجیب و غریب شخص تھا۔ عربی، فارسی، اردو، ترکی کا یگانہ عالم، خوش ذوق شاعر، چاروں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ ذاتی شجاعت میں بھی کسی سے کم نہ تھا لیکن ذاتی اقتدار کی ہوس میں سلطنت کو بری طرح تباہ کیا۔ آخری دور کے امیروں میں سے دو شخص ہیں، جن کی گردن پر مغل سلطنت کا خون ہے ایک یہی عماد الملک، دوسرا اس کا رفیق و کارندہ آدینہ بیگ جس کے نام پر دینانگر (ضلع گورداسپور) آباد ہوا۔

عماد الملک نے پہلے احمد شاہ ابن محمد شاہ کو تخت سے اتارا اور عزیز الدین کو عالمگیر ثانی کے لقب سے بادشاہ بنایا۔ پھر جب اس سے دل پھر گیا تو ایک درویش کی زیارت کے فریب سے باہر لے جاکر قتل کرا دیا، لیکن خود بھی چین نہ پایا۔ پہلے دکن کی طرف چلا گیا۔ پھر گوالیار کے راجا سندھیا نے بارہ گاؤں کی جاگیر دے دی جسے باونی کہتے تھے۔ حج بھی کیا۔ کالپی میں ۱۸۰۰ء میں وفات پائی۔

غلام حسین طباطبائی نے سیر المتاخرین میں عماد الملک کی بے باکی کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے یہ پانی پت میں تھا کہ بدخشی فوج نے تنخواہ کا مطالبہ کیا۔ عماد الملک نے حکم دے دیا کہ بر سرکار فوجیوں کی تنخواہ حساب کرکے دے دی جائے۔

یہ حکم ان لوگوں کو بُرا معلوم ہوا جو بے حساب روپے کھا رہے تھے۔ ایک گروہ نے
عماد الملک کی قیامگاہ کے باہر گھیرا ڈال کر شور مچانا شروع کیا۔ نواب انھیں سمجھانے
کے لیے باہر آیا تو شورشیوں نے اُسے پکڑ لیا اور کپڑے پھاڑ ڈالے۔ عماد الملک نے
کہا کہ جو جا ہو کرو، خواہ قتل کر ڈالو لیکن تنخواہ حساب کے مطابق دوں گا۔ آخر نواب
کی مندپوری ہوئی۔ بدخشیوں نے اسے چھوڑا۔ واپس آکر فوج مہیا کی اور بدخشیوں
کو تباہ کر ڈالا جو وقت کے بہترین سپاہی تھے۔

نواب صدیق حسن خاں نے قتیل کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ (قتیل)
دہلی ہوتا ہوا کالپی پہنچا۔ اور وہاں عماد الملک کا مصاحب رہا بعد میں لکھنؤ گیا۔
(تذکرۂ شمع انجمن صفحہ ۳۹۰)

عماد الملک کا تخلص نظام تھا۔ تذکرہ "شمع انجمن" میں اس کے شعر موجود ہیں
کہتے ہیں ایک مثنوی مولانا فخرالدین فخر عالم کی کرامتوں کے متعلق لکھی تھی۔

شفقؔ اس عماد الملک کا پڑوتا تھا۔ نسب نامہ یہ ہے۔ سعدالدین شفقؔ
ابن افضل الدولہ احمد بخش خاں بےتابؔ، ابن ناصر الدولہ ابن عماد الملک نظامؔ۔

شفقؔ، احمد علی قلقؔ کا شاگرد تھا۔ گلستان سخن مرتبہ میرزا صابر (جو تذکرہ صہبائی
کے نام سے مشہور ہے) اور شعرا مؤلفہ نساخ میں شفقؔ کے صرف اردو شعر درج
ہیں۔ لیکن غالب کی تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فارسی شعر بھی کہتا تھا۔

(۱)

قبلہ حاجات

قصیدہ دوبارہ پہنچا۔ چونکہ پیشانی پر دستخط کی جگہ نہ تھی، ناچار اس کو ایک اور
دو ورقہ پر لکھوایا اور حضور میں گزرانا اور تمنائے دیرینہ حاصل کی۔ یعنی دستخط خاص

۱؎ یعنی شفق نے بہادر شاہ کی مدح میں قصیدہ بھیجا تھا جو غالب کی وساطت سے پیش ہُوا اور پادشاہ
نے اس پر خوشنودی کا شقہ لکھا۔

مشتملِ اظہارِ خوشنودیِ طبعِ اقدس ہو گئے۔ احترام الدولہ[1] بہادر میرے ہم زبان اور آپ
کے ثنا خوان رہے گویا اس امرِ خاص میں وہ شریکِ غالب ہیں، ہم بطریق کسرۂ اضافی
و ہم بطریق کسرۂ توصیفی[2]۔ پروردگار اس بزرگوار کو سلامت رکھے کہ قدردانِ کمال، بلکہ
حق تو یوں ہے کہ خیرِ محض ہے۔

"غیاث اللغات" ایک نام موقر و معزز، جیسے الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی۔ آپ
جانتے ہیں کہ یہ کون ہے[3]؟ ایک معلم فرومایہ رام پور کا رہنے والا، فارسی سے ناآشنائے
محض اور صرف و نحو میں ناتمام، انشاء خلیفہ و منشآت مادھورام کا پڑھانے والا،
چنانچہ دیباچہ میں اپنا ماخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادھو رام و غنیمت و قتیل
کے کلام کو لکھا ہے۔ یہ لوگ[4] راہِ سخن کے غول ہیں، آدمی کے گمراہ کرنے والے۔ یہ فارسی
کو کیا جانیں؟ ہاں طبع موزوں رکھتے تھے:

ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار   اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

میرا دل جانتا ہے کہ آپ کے دیکھنے کا میں کس قدر آرزومند ہوں۔ میرا ایک بھائی،
ماموں کا بیٹا، نواب ذوالفقار بہادر[5] کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشین حال

۱؎ حکیم احسن اللہ خاں جو قصیدہ پیش کرنے کے وقت موجود تھے۔

۲؎ "شریکِ غالب" کے دو مفہوم ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ میرزا غالب کے شریک رہے، یہ شرکت بر کسرۂ اضافی تھی، دوسرا یہ کہ زیرِ بحث کام میں ان سے زیادہ مدد ملی، گویا وہ شریکِ غالب تھے یہ شرکت بر کسرۂ توصیفی ہوئی۔

۳؎ ملا غیاث الدین رام پوری صاحب "غیاث اللغات"

۴؎ یعنی غنیمت اور قتیل وغیرہ

۵؎ والی باندہ بوندیل کھنڈ۔ اس خاندان کے حالات جو مجھے معلوم ہوتے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ)

کا چچا تھا اور وہ میرا ہم شیر بھی تھا، یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ

(بقیہ حاشیہ) چھتر سال بوندیلہ کے خاندان کی ایک لڑکی کسی لڑائی میں محمد خاں بنگش کے ہاتھ قید ہوئی پھر باجی راؤ پیشوا نے قیدیوں کو چھڑایا تو چھتر سال نے اس لڑکی کو اپنے خاندان میں لینے کے متعلق پس و پیش شروع کر دی۔ اس لیے کہ وہ مسلمانوں کی قید میں رہ چکی تھی اور اس اثنا میں مسلمان ہو چکی تھی۔ باجی راؤ نے اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شمشیر بہادر رکھا گیا۔ چونکہ اس کی والدہ کو مسلمان سمجھا جاتا تھا اس لیے باجی راؤ کی وفات کے بعد مرہٹوں نے اسے پیشوا کے خاندان کا فرد سمجھنے سے انکار کر دیا۔ باندہ بوندیل کھنڈ کا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔ شمشیر بہادر کھلم کھلا مسلمان ہو گیا۔ وہ پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں کی طرف سے لڑا تھا۔ زخمی ہوا اور بھرت پور پہنچ کر وفات پائی۔

اس کے لڑکے علی بہادر نے مادھوجی سندھیا کی امداد سے بوندیل کھنڈ کے کئی علاقے فتح کیے غلام قادر خاں روہیلے کو گرفتار کرنے میں مدد دی جس نے شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکالی تھیں اور ماہی مراتب کا اعزاز حاصل کیا۔ دہلی میں مرا اور قطب صاحب میں دفن ہوا۔ اس کے بیٹے ذوالفقار بہادر نے ۱۸۱۲ء میں انگریزوں سے معاہدہ کر کے نواب کا خطاب اور باندے کی ریاست حاصل کی۔ ذوالفقار بہادر غالب کی ممانی کی بہن کا لڑکا تھا۔ وہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا علی بہادر نواب ہوا۔ غالب نے اسی کے لیے لکھا تھا:

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

زمانۂ غدر میں علی بہادر نے انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں، پھر انگریزوں کے مخالفوں کا زور بہت بڑھ گیا تو علی بہادر بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ اس وجہ سے باندے کی ریاست ضبط ہو گئی اور علی بہادر کو تین ہزار ماہوار پنشن دے کر اندور میں بٹھا دیا گیا۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ذوالفقار بہادر اور امرائو بہادر۔ آخر الذکر کا لقب شمشیر بہادر تھا اور تخلص دلیر۔ وہ جلال لکھنوی کا شاگرد تھا۔ ۱۹۲۰ء میں اس کا دیوان شائع ہوا تھا۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔ علی بہادر نے ۱۸۷۳ء میں وفات پائی۔

پیا تھا۔ وہ باعث ہُوا تھا میرے باندا بوندیل کھنڈ آنے کا۔ مَیں نے سب سامان سفر کر لیا، ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دے دیا۔ قصد یہ تھا کہ فتح پور تک ڈاک میں جاؤں گا، وہاں سے نواب علی بہادر کے ہاں کی سواری میں باندے جا کر، ہفتہ بھر رہ کر، کالپی ہوتا ہُوا، آپ کے قدم دیکھتا ہُوا، بسبیل ڈاک دلّی چلا آؤں گا۔ ناگاہ حضور والا[1] بیمار ہوگئے اور مرض نے طول کھینچا۔ وہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آیا اور پھر مرزا اورنگ نمان، میرا بھائی مرگیا:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

واللہ وہ سفر اگرچہ بھائی کی استدعا سے تھا مگر میں نتیجہ اس شکل کا آپ کے دیدار کو سمجھا ہُوا تھا۔ ہرزہ سرائی کا جرم معاف کیجیے گا۔ میرا جی آپ کے ساتھ باتیں کرنے کو چاہا، اس واسطے جو دل میں تھا، وہ اس عبارت سے زبان پر لایا[2]۔

(۲)

کیوں کر کہوں کہ مَیں دیوانہ نہیں ہوں؟ ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوشمندی ہے کہ قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں۔ نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم۔ سُن غالب، ہم تجھ سے کہتے ہیں، بہت مصاحب نہ بن، ایاز حد خود بشناس۔ مانا کہ تو نے کئی برس کے بعد رات کو نوبیت کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے، مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے؟ پہلے القاب لکھ، پھر

---

[1] بہادر شاہ ثانی۔

[2] "خطوطِ غالب" میں اسے ۱۸۵۶ء کا بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ بداہتہً غلط ہے۔ اس میں بہادر شاہ ثانی کی بیماری کا ذکر ہے۔ وہ جولائی ۱۸۵۳ء میں سخت بیمار ہوئے تھے یہاں تک کہ جانبری کی امید نہیں رہی تھی۔ یہ خط یقیناً ۱۸۵۶ء سے پہلے کا ہے۔

ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ، پھر عنایت نامہ کے آنے کا شکریہ ادا کر کہ جو مَیں تصوّر کر رہا تھا، وہ ہوا یعنی جس دن صبح کو میں نے خط بھیجا، اُسی دن آخر روز حضور کا فرمان پہنچا۔ معلوم ہُوا کہ حرارت ہنوز باقی ہے۔ انشاء اللہ رفع ہو جائے گی۔ موسم اچھا آگیا ہے:

گرمی از آب بروں رفت و حرارت ز ہوا　　　محل مہر جہانتاب بہ میزاں آمد

اگر صرف بترید و تعدیل سے کام نکل جائے تو کیا کہنا، ورنہ بحسب رائے طبیب تنقیہ کرائیے۔ مجھ کو بھی آج دسواں منضج ہے۔ پانچ سات دن کے بعد مسہل ہو گا۔
شب کو ناگاہ ایک نئی زمین خیال میں آئی۔ طبیعت نے راہ دی، غزل تمام کی۔ اُسی وقت سے یہ خیال میں تھا کہ کب صبح ہو اور کب یہ غزل نواب صاحب کو بھیجوں۔ خدا کرے آپ پسند کریں اور میرے قبلہ جناب میر امجد علی صاحب کو سنا دیں اور میرے شفیق منشی نادر حسین خاں اور اُن کے بھائی صاحب اس کو پڑھیں۔ پروردگار اس مجمع کو سلامت رکھے۔

غزل

اے ذوقِ نواسنجی، بازم بہ خروش آور　　　غوغائے شبیخونے، بر بُنگہ ہوش آور
گر خود بجہد از سر، از دیدہ فرو بارم　　　دل خون کن و آں خوں را۔ در سینہ بجوش آور
ہاں ہمدمِ فرزانہ، دانی رہ ویرانہ　　　شمعے کہ نخواہد شد از باد خموش آور
شورابۂ ایں وادی تلخ است، اگر راہی　　　از شہر بسوئے من، سرچشمۂ نوش آور
دانم کہ زرے داری، ہر جا گزرے داری　　　مے گر نہ دہد سلطاں، از بادہ فروش آور
گر مُغ بہ کدو ریزد، بر کف نہ و راہی شو　　　ور شہ بہ سبو بخشد، بردار و بدوش آور
ریحاں دمد از مینا، رامش چکد از قلقل　　　آں در رہِ چشم افگن، دیں از پئے گوش آور
گاہے بہ سبک دستی، زاں بادہ زخویشم بر　　　گاہے بہ سیہ مستی، از نغمہ بہ ہوش آور

غالب کہ بقایش باد، ہم پایہ تو گر ناید بارے غزلے، فردے، زاں موینہ پوش آید

دوشنبہ ۲۱۔ محرم ۱۲۷۲ھ

(۳)

للہ الشکر کہ پیر و مرشد کا مزاج اقدس بہ خیر و عافیت ہے۔ پہلے نوازش نامہ کا جواب باآنکہ وہ مشتمل ایک سوال پر تھا، ہنوز لکھنے نہیں پایا کہ کل ایک مکرمت نامہ آیا۔ بندہ عرض کر چکا ہے کہ مسہل میں ہوں۔ چنانچہ کل تیسرا مسہل ہوگیا۔ اس سبب سے توقیع کا پاسخ نگار نہ ہوسکا اور لکھتا بھی تو یہی لکھتا، جو آپ نے لکھا ہے۔

"اَرِنی" کی رے کی حرکت و سکون کے باب میں قول فیصل یہی ہے جو حضرت نے لکھا ہے۔ اگر تقطیع شعر مساعدت کر جائے اور "ارنی" "بر وزن" "چمنی" گنجایش پائے، تو نعم الاتفاق ہے، ورنہ قاعدۂ تصرف مقتضی جواز ہے[1]۔ مرزا عبدالقادر بیدل:

موسی بطور رہمت اَرْنی مگو و بگریز کہ نیرزد ایں تمنّا بجواب لن ترانی

اسداللہ بیگ غالب:

رفت آنکہ ما ز حسن مدارا طلب کنیم سر رشتہ در کف اَرِنی گوے طور بود

زوائد سے فارغ ہو کر عرض کرتا ہوں کہ ہائے کیا غزل لکھی۔ قبلہ آپ فارسی کیوں نہیں کہا کرتے؟ کیا پاکیزہ زبان ہے اور کیا طرز زبان۔ کیا میں سخن ناشناس اور ناانصاف ہوں کہ ایسے کلام کے حک و اصلاح پہ جرأت کروں؟:

چہ حاجت ست بشاطہ روے زیبا را

ہاں ایک جگہ آپ تحریر میں سہو کر گئے ہیں:

اے مطرب جادو فن، بازم رہ ہوشم زن

---

[1] یعنی رے کو ساکن باندھا جاسکتا ہے۔

دو میم آپڑے ہیں، ایک میم محض بیکار ہے۔ "دیگر" کی جگہ آپ "بازم" لکھ گئے ہیں:

اے مطرب جادو فن، دیگر برہ ہوشم زن

اب دیکھیے اور صاحبوں کی غزلیں کب آتی ہیں۔ اتنی عنایت فرمائیے گا کہ ہر صاحب کے تخلص کے ساتھ ان کا اسم مبارک اور کچھ حال رقم کیجیے گا۔ زیادہ حد ادب۔

پنجشنبہ، ششم صفر ۱۲۷۲ھ

(۴۷)

پیر و مرشد

حضور کا توقیع خاص اور آپ کا نوازش نامہ، یہ دونوں حرز بازو ایک دن اور ایک وقت پہنچے۔ توقیع کا جواب دو چار دن میں لکھوں گا۔ ناسازی مزاج مبارک موجب تشویش و ملال ہوئی۔ اگرچہ حضرت کی تحریر سے معلوم ہوا کہ مرض باقی نہیں، مگر ضعف باقی ہے لیکن تسکین خاطر منحصر اس میں ہے کہ آپ بعد اس تحریر کے ملاحظہ فرمانے کے، اپنے مزاج کا حال پھر لکھیں۔ سینتیس روپے کی ہنڈوی پہنچی۔ اس کا بھی حال مطابق کی ہنڈوی کا سا ہے، یعنی ساہوکار کہتا ہے کہ ابھی ہم کو کالپی کے ساہوکار کی اجازت نہیں آئی، جو ہم روپیہ دیں۔ اگر سرکار کے کارپرداز وہاں کے ساہوکار سے کہہ کر اجازت لکھوا بھیجیں، تو مناسب ہے۔

صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد میری ملک میں سے، میرے پاس تھی، وہ میں اپنی طرف سے بسبیل ارمغان آپ کو بھیجتا ہوں۔ نذر قبول ہو۔ اب میں حضرت سے باتیں کر چکا۔ خط کو سرنامہ کر کے کہار کو دیتا ہوں کہ ڈاک میں دے آوے۔ بارہ پر دو بجے کتاب کا پارسل بطریق بیرنگ روانہ کروں گا۔ پیشگاہ وزارت[۱] میں میری بندگی پہنچے

۱۔ معلوم نہیں اس سے کون مراد ہے؟ غالباً انور الدولہ کے والد مراد ہیں۔

عرضداشت بعد اس کے پہنچے گی۔ جناب میر صاحب قبلہ میر امجد علی صاحب کو سلام نیاز اور جناب منشی نادر حسین خاں کو سلام۔

(۵)

پیر و مرشد

اگر مَیں نے اُمید "گاہ" بکاف عربی از راہ شکوہ لکھا، تو کیا گناہ کیا؟ نہ خط کا جواب، نہ قصیدے کی رسید:

دریں خستگی پوزش از من مجوے　　　بود بندۂ خستہ گستاخ گوے

اور یہ جو آپ فرماتے ہیں کہ ان موانع کے سبب سے میں قصیدہ کی تحسین نہیں لکھ سکا، بندہ بے ادب نہیں، تحسین طلب نہیں، ایسے مجمع میں محشور ہوں کہ سوائے احترام الدولہ کے کوئی سخن دان نہیں۔ مَیں جو اپنا کلام آپ کے پاس بھیجتا ہوں، گویا آپ اپنے پر احسان کرتا ہوں:

وائے بر جانِ سخن گر بہ سخنداں نہ رسد

افسوس کہ میرا حال، اور یہ لیل و نہار، آپ کی نظر میں نہیں، ورنہ آپ جانیں کہ اِس بجھے ہوئے دل اور اس ٹوٹے ہوئے دل اور اس مرے ہوئے دل پر کیا کر رہا ہوں۔ نواب صاحب، اب نہ دل میں وہ طاقت، نہ قلم میں زور۔ سخن گستری کا ایک ملکہ باقی ہے، بے تامل اور بے فکر جو خیال میں آجائے وہ لکھ لوں، ورنہ فکر کی صعوبت کا تحمل نہیں ہوسکتا۔ بقول مرزا عبدالقادر بیدل:

جہدہا در خورِ توانائی ست　　　ضعف یکسر فراغ مے خواہد

مُہر کا حال معلوم ہوا۔ پہلے آپ لکھ بھیجیے کہ کیا کھودا جائے گا؟ مہدی حسین خان، مہدی حسین خان بہادر؟ لکھ رہا ہوں، صرف یاد پر لکھ رہا ہوں ورنہ خط لڑکوں نے کھو دیا ہے یاد پڑتا ہے کہ نگینہ وہاں سے بھیجنے کو آپ نے لکھا سو اب مکرر خواہاں ہوں کہ یہ معلوم ہو جائے کہ نگینہ بھیجیے گا یا یہاں سے خریدا جائیگا، اور نقش نگیں کیا ہوگا تاکہ شمار حروف کا مجھ کو

معلوم رہے اب جب آپ مجھ کو لکھیں گے تب میں اس کا جواب لکھوں گا۔ حافظ صاحب کا پہنچنا تقریباً معلوم ہُوا۔ یعنی ان کی طرف سے آپ نے مجھ کو سلام لکھا ہے، سو میں بھی ان کی خدمت میں بندگی اور جناب منشی نادر حسین خاں صاحب کی جناب میں سلام عرض کرتا ہوں۔ زیادہ حدِ ادب۔

(۶)

پیر و مرشد

یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔ خلاصہ عرض کا یہ ہے کہ آج شہر میں بدر علی خاں کا نظیر نہیں۔ بس مُہر اور کون کھود سکے گا؟ ناچار میں نے آپ کا نوازش نامہ، جو میرے نام تھا، وہ ان کے پاس بھجوا دیا۔ انھوں نے رقعہ میرے نام آج بھیجا۔ سو وہ رقعہ حضرت کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں نہیں سمجھا کہ قسم دوم پکھراج کی کیا ہے؟ آپ پڑھ لیں اور سمجھ لیں اور نگین بہ احتیاط ارسال فرماویں۔ پھر روپے کے بھیجنے کی ابھی ضرورت نہیں ہے، جب میں عرض کروں، تب بھیجیے گا۔ تعجب ہے کہ جناب میر امجد علی صاحب قلق کا خط میں سلام نہ تھا۔ متوقع ہوں کہ چھاپے کے قصیدے اُن کو سُنا دیے جائیں اور میری بندگی کہی جائے۔ جناب منشی نادر حسین خاں صاحب کو میرا سلام بہ ہزار اشتیاق پہنچے۔

(۷)

قبلہ و کعبہ

وہ عنایت نامہ جس میں حضرت نے مزاج کی شکایت لکھی تھی پڑھ کر بے چین ہو گیا ہوں اور عرض کر چکا ہوں کہ مزاج کا حال مفصل لکھیے۔ چونکہ آپ نے کچھ نہیں لکھا تو اور زیادہ مشوش ہوں۔ نسخۂ رفعِ تشویش یعنی شفقت نامہ جلد بھیجیے۔

جناب منشی نادر حسین خاں صاحب کا کچھ حال معلوم نہیں۔ حضرت میر امجد علی صاحب کا کچھ حال معلوم نہیں۔ متوقع ہوں کہ ان دونوں صاحبوں کی خدمت میں میرا سلام پہنچے اور آپ ان کی خیر و عافیت لکھیں۔ کبوتروں کا نسخہ، جیسا کہ میرے پاس آیا، بجنسہٖ ارسال کرتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ میرن صاحب نے انتقال کیا۔ یہ چھوٹے بھائی تھے، مجتہد العصر لکھنؤ کے، نام ان کا سید حسین اور خطاب سید العلماء نقش نگین "میر حسین ابن علی"۔ مَیں نے ان کی رحلت کی ایک تاریخ پائی ہے جس میں پانچ بڑھتے تھے یعنی ۱۲۷۸ ہوتے تھے۔ تخرجہ نئی روش کا میرے خیال میں آیا۔ مَیں تو جانتا ہوں اچھا ہے، دیکھو، آپ پسند فرماتے ہیں یا نہیں:

"حسین ابن علی" آبروے علم و عمل — کہ "سید العلما" نقش خاتمش بودے
نماند و ماندے اگر زندہ پنج سال دگر — "غم حسین علی" سال ماتمش بودے

زیادہ حد ادب۔ عرض داشت جواب طلب

دوم ربیع الاول ۱۲۷۳ھ (۱۰۔ نومبر ۱۸۵۶ء)

(۸)

حضرت پیر و مرشد،

اگر آج میرے سب دوست و عزیز یہاں فراہم ہوتے اور ہم اور وہ باہم ہوتے، تو مَیں کہتا کہ آؤ اور رسم تہنیت بجا لاؤ۔ خدا نے پھر وہ دن دکھایا کہ ڈاک کا ہرکارہ انوار الدولہ کا خط لایا:

ایں کہ مے بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

منہ پیٹتا ہوں اور سر پٹکتا ہوں کہ جو کچھ لکھا چاہتا ہوں، نہیں لکھ سکتا ہوں۔ الٰہی حیات جاودانی نہیں مانگتا، پہلے انوار الدولہ سے مل کر سرگزشت بیان کروں،

پھر اس کے بعد مروں۔ روپیہ کا نقصان اگرچہ جانکاہ اور جانگزا ہے، پر بموجب "تلف المال خلف العمر" عمر فزا ہے۔ جو روپیہ ہاتھ سے گیا اس کو عمر کی قیمت جانیے اور ثبات ذات اور بقائے عرض و ناموس کو غنیمت جانیے۔ اللہ تعالیٰ وزیر اعظم کو سلامت رکھے اور اس خاندان کے نام و نشان اور عزّ و شان کو برقرار تا قیامت رکھے۔ مَیں نے گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں بعبارت فارسی ناآمیختہ بعربی، لکھی ہے اور وہ پندرہ سطر کے مسطر سے چار جزو کی کتاب آگرے کو مفید الخلائق میں چھپنے کو گئی ہے "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے۔ بعد چھپ جانے کے وہ نسخہ حضرت کی نظر سے گزرانوں گا اور اس کو ہم سخنی اور ہم زبانی جانوں گا۔

جناب میر امجد علی صاحب کا جو آپ کے خط میں ذکر نہیں آیا ہے تو اس خیر خواہ احباب کا دل گھبرایا ہے۔ اب جو خط لکھیے تو ان کی خیر و عافیت بہر نمط لکھیے۔ ان کو بندگی اور جناب منشی نادر حسین خاں صاحب کو سلام پہنچے۔

اکتوبر ۱۸۵۸ء

(۹)

پیر و مرشد

ایک نوازش نامہ آیا اور "دستنبو" کے پہنچنے کا مژدہ پایا۔ اس کا جواب یہی کہ کارپردازان ڈاک کا احسان مانا اور اپنی محنت کو رایگاں نہ جانا۔ چند روز کے بعد ایک عنایت نامہ اور پہنچا، گویا ساغر التفات کا دوسرا دَور پہنچا۔ اب ضرور آپڑا کہ کچھ حال اس ستارۂ دُم دار کا لکھوں۔ چنانچہ جس وقت سے وہ خط پڑھا ہے سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں۔ چونکہ بسبب فقدان اسباب، یعنی عدم رصد و کتاب،

"تا نہال دوستی کے بر دہد حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم"

(۱۰)

پیرو مرشد،

کیا حکم ہوتا ہے؟ احمق بن کر چُپ ہو رہوں یا جواز روے کشف یقینی مجھ پر حالی ہوا ہے وہ کہوں؟ اول رجب میں آپ نے نوازش نامہ کب بھیجا؟ آخر میرے پاس پہنچ ہی گیا، یہ جواب بھیجا، اگر روانہ ہُوا ہوتا تو وہ بھی پہنچ گیا ہوتا۔ بہرحال محبت کی گرمی ہنگامہ ہے، یہ جملہ محض آرایش عنوان نامہ ہے:

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

پنسن داروں کا اجراء پنسن اور اہل شہر کی آبادی مسکن، یہاں اس صورت پر نہیں ہے جیسی اور کہیں ہے۔ اور جگہ سیاست ہے کہ منجملہ ضروریات ریاست ہے، یہاں قہرالہی ہے کہ منشار تباہی ہے۔ خاص میرے پنسن کے باب میں گورنمنٹ سے رپورٹ طلب ہوئی ہے۔ ابنار روزگار حیران ہیں کہ یہ بھی ایک بات عجب ہوئی ہے۔ رپورٹ کی روانگی کی دیر ہے، چند روز اور بھی قسمت کا پھیر ہے۔ دلی مقدمۂ لفٹنٹ گورنر سے انقطاع پا گئی اور احاطہ پنجاب کے تحت حکومت آ گئی۔ رپورٹ یہاں سے لاہور اور لاہور سے کلکتہ جائے گی اور اسی طرح پھیر کھا کر نوید حکم منظوری آئے گی۔

فعل لازمی کو جب متعدی کیا چاہیے تو پہلے مضارع میں سے مصدر بنا لینا چاہیے۔ "گشتن" مصدر اصلی "گردد" مضارع، "گردیدن" مصدر مضارعی۔ "گردانِدن" و "گردانیدن" مصدر متعدی۔ موافق اس قاعدے کے "کردن" کا متعدی "کنانِدن" و "کنانیدن" نہ کہ "کرانِدن"۔ "کرانِدن" تو کرانے کی فارسی ہے، جیسے چلنے کی فارسی "چلیدن" ہے اور یہ شوخی طبع و ظرافت ہے، نہ اس میں صحت ہے، نہ لطافت ہے۔ "کرانِدن" غلط اور کنانیدن صحیح، "گشتن کو گشتانِدن" اور "رستن" کو رستانِدن نہ کہیں گے۔

بلکہ "گرویدن" و "روئیدن" بنا کر "گردانیدن" و "رویانیدن" لکھیں گے۔ بلغا کے کلام میں کردن کا متعدی شاید کہیں نہ آیا ہو، اگر آیا ہوگا تو کنانیدن آیا ہوگا۔ "کراندن" ٹکسال باہر ہے۔

تذکیر و تانیث کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ "دہی": بعض کہتے ہیں "دہی اچھا" بعض کہتے ہیں "دہی اچھی"۔ "قلم": کوئی کہتا ہے: "قلم ٹوٹ گیا"، کوئی کہتا ہے: "قلم ٹوٹ گئی"۔ فقیر "دہی" کو مذکر بولتا ہے اور قلم کو بھی مذکر جانتا ہے علیٰ ہذالقیاس شنگرف بھی مذبذب ہے۔ کوئی مذکر اور کوئی مونث کہتا ہے۔ میں تو شنگرف کو مونث کہوں گا۔ خلاصہ یہ کہ اس ہیچ مداں کے نزدیک "کردن" کا متعدی "کنانیدن" ہے اور "شنگرف" مونث۔

خداوند، آئین بندہ پروری بھول نہ جاؤ۔ گاہ گاہ نامہ و پیام بھیجتے رہو۔ کیا میں کہہ نہیں سکتا کہ میں نے اس عرصے میں دو خط بھیجے اور آپ نے ایک کا جواب نہیں لکھا؛ ہاں یہ عرض کرتا ہوں، آج صبح کو آپ کا خط آیا، اُدھر پڑھا اور ادھر جواب لکھا۔ سچ یوں ہے کہ ڈاک میں اکثر خطوط تلف ہو جاتے ہیں۔ بیرنگ پر ضائع ہونے کا گمان کم ہے۔ اس دستور کا بادی اور بانی میں ہوتا ہوں، یہ خط بیرنگ بھیجتا ہوں، آپ بھی اب جب کبھی بفرض محال خط بھیجیے تو بیرنگ بھیجیے۔ زیادہ حدِ ادب۔

نگاشتہ چہار شنبہ، سوم شعبان (۱۲۷۵ھ)

دہم مارچ سال حال (۱۸۵۹ء)

(۱۱)

پیر و مرشد، ۱۲ بجے تھے۔ میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقّہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا یا کرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا؛ میرا نقصان ہوتا۔

سرے سے سنئے: آپ کا قصیدہ بعد اصلاح بھیجا۔ اس کی رسید آئی۔ کٹے ہوئے شعر اُلٹے آئے تو ان کی قباحت پوچھی گئی، قباحت بتائی گئی۔ الفاظ قبیح کی جگہ بے عیب الفاظ لکھ دیئے گئے۔ لو صاحب یہ اشعار بھی قصیدہ میں لکھ لو۔ اس نگارش کا جواب آج تک نہیں آیا۔ شاہ اسرارالحق کے نام کا کاغذ اُن کو دیا۔ جواب میں جو کچھ انھوں نے زبانی فرمایا، آپ کو لکھا گیا، حضرت کی طرف سے اس تحریر کا بھی جواب نہ ملا:

پُر ہوں مَیں شکوے سے، یوں راگ سے جیسے باجا ۔ اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

سوچتا ہوں کہ دونوں خط بیرنگ گئے تھے۔ تلف ہونا کسی طرح متصوّر نہیں۔ خیر اب بہت دن کے بعد شکوہ کیا لکھا جائے، باسی کڑھی میں اُبال کیا آئے؟ بندگی، بیچارگی۔

پانچ لشکر کا حملہ پے درپے اس شہر پر ہوا: پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لُٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں[1] کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لُٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی۔ مرے آدمی کم، لیکن جس کو تپ آئی اس نے پھر اعضا میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر سے دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں، ایک بڑا لڑکا اور ایک میرا داروغہ۔ خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

برسات یہاں بھی اچھی ہوئی ہے، لیکن نہ ایسی کہ جیسی کالپی اور بنارس میں۔ زمیندار خوش، کھیتیاں تیار ہیں۔ خریف کا بیڑا پار ہے۔ ربیع کے واسطے پوہ ماہ میں

۱؎ انگریزی فوج، جنھیں خاکی غالباً اس وجہ سے کہا کہ ان کی وردی خاکی رنگ کی تھی۔

بینہ درکار ہے۔ کتاب کا پارسل پرسوں ارسال کیا جائے گا۔

اہاہاہا، جناب حافظ محمد بخش صاحب! میری بندگی۔" مغل علی[1] خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستقی ہو کر مر گئے۔ ہے ہے کیوں کر لکھوں! حکیم رضی الدین خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی ماردی اور احمد حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے رخصت لے کر آئے تھے۔ غدر کے سبب جانہ سکے، یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں پر یقین ہے کہ مردے سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحبزادہ میاں نظام الدین[2] کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر سے بھاگے تھے، وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے، اورنگ آباد میں رہے، حیدرآباد میں رہے۔ سال گزشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہوگئی، لیکن صرف جان بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ، جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے، وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی، جس میں مغل علی خاں مرحوم رہتے تھے۔ وہ، اور خواجہ صاحب کی حویلی، یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی والدہ کے نام کی ہیں وہ ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی ہے۔ فی الحال میاں نظام الدین پاکپٹن گئے ہیں۔ شاید بہاول پور بھی جائیں گے۔

(۱۸۶۰ء)

(۱۲)

پیرومرشد معاف کیجیے گا: میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھا حال

یہاں کبھی کسی نے اس دریا کی کوئی حکایت ایسی نہیں کی کہ جس سے استبعاد اور استعجاب پایا جائے۔ پرسش کے بعد بھی کوئی بات نہیں سُنی۔ سنیے تو سہی، موم

۱؎ غالب کے دوست تھے۔ شاہی دربار میں کسی اچھے عہدے پر مامور تھے۔

۲؎ فرزند شیخ نصیرالدین عرف کالے میاں۔

کیا سب ہے؟ گرمی، جاڑا، برسات، تین فصلیں اکٹھی ہوگئی ہیں، مگر گ باری علاوہ ایک بحر، اس کی حقیقت متغیر ہو جائے تو محل استعجاب کیوں نہ ہو؟ اور یہ بات کہ دلی میں تغیر نہ ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جمنا بہ انفراد[۱] بہ رہی ہے، اور وہاں کہیں "کہیں" کہیں کوئی اور ندی اور کہیں گنگا باہم مل گئی ہیں۔ مجمع البحار ہے۔

حضرت نے خوب وکالت کی۔ مولانا قلق سے تقصیر میری معاف نہ کروائی۔ کہہ دو گے کہ گناہ معاف ہوگیا۔ میں بغیر سارٹیفکٹ کے کب مانوں گا۔

یہ دن مجھ پر بُرے گزرتے ہیں۔ گرمی میں میرا حال بعینہ وہ ہوتا ہے، جیسا زبان سے پانی پینے والے جانور کا۔ خصوصاً اس تموز میں کہ غم وہم کا ہجوم ہے:

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

یوم الخمیس ۲۹۔ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ

مرگ کا طالب غالب (۱۹۔ جولائی سنہ ۱۸۶۰ء)

(۱۳)

پیر و مرشد،

شب رفتہ کو مینہ برسا۔ ہوا میں فرطِ برودت سے گزند پیدا ہوگیا۔ اب صبح کا وقت ہے۔ ہوا ٹھنڈی بے گزند چل رہی ہے۔ ابر تنک محیط ہے۔ آفتاب نکلا ہے، پر نظر نہیں آتا ہے۔ میں عالم تصور میں آپ کو مسند عزّ و جاہ پر جانشین اور منشی نادر حسین خاں صاحب کو آپ کا جلیس مشاہدہ کرکے آپ کی جناب میں کورنش بجالاتا ہوں اور منشی صاحب کو سلام کرتا ہوں۔ کافر نعمت ہو جاؤں اگر یہ مدارج بجا نہ لاؤں۔ حضرت نے اور منشی صاحب نے میری خاطر سے کیا زحمت

---

[۱] یعنی اکیلی

اٹھائی ہے۔ صاحبؒ بہت خوشنود ہوئے۔ منت پذیری میں میرے شریک غالب ہیں۔ فی الحال بہ توسط میرے سلام نیاز کرتے ہیں۔ اغلب ہے کہ نامہ جداگانہ بھی ارسال کریں۔ حضرت، آپ غالب کی شرارتیں دیکھتے ہیں؟ سب کچھ کہے جاتا ہے اور اس اصل کا کہ جس پر یہ مراتب متفرع ہوں، ذکر نہیں کرتا۔ فقیر کو یہ طرز پسند نہ آئی۔ مطلب اصلی کو مقدر چھوڑ جانا کیا شیوہ ہے؟ یوں لکھنا تھا کہ آپ کا عنایت نامہ، اس کے ساتھ نسب نامہ خاندان مجد و علا کا پارسل پہنچا، میں ممنون ہوا، نواب ضیا الدین خاں بہادر بہت ممنون و شاکر ہوئے۔ جناب عالی ہیں تو غالب ہرزہ سرا کا معتقد نہ رہا۔ آپ نے اس کو مصاحب بنا رکھا ہے، اس سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔ قبلہ وکعبہ جناب مولانا قلق کی خدمت میں حضرت شفق نے جو غالب کی شکایت کی تھی، وہ مقبول نہ ہوئی۔ اب جناب ہاشمی کو اپنا ہم زبان اور مددگار بنا کر پھر کہتے ہیں۔ آپ کی بات اس باب میں کبھی نہ مانوں گا، جب تک سیّد صاحب کا خوشنودی نامہ نہ بھجوائیے گا۔ اس سارٹیفکیٹ کے حصول میں رشوت دینے کو بھی موجود ہوں۔ والسّلام۔

(۱۴)

پیرومرشد، کورنش۔ مزاج اقدس؟ "الحمدللہ، تو اچھا ہے۔" "حضرت دعا کرتا ہوں۔"

پرسوں آپ کا خط مع سارٹیفکیٹ کے پہنچا۔ آپ کو مبداء فیاض سے اشرف الوکلاء خطاب ملا۔ محتنانہ، مجتبانہ۔

ایک لطیفہ نشاط انگیز سنیئے۔ ڈاک کا ہرکارہ، جو بلّی ماروں کے خطوط پہنچاتا ہے،

۱؎ ضیاء الدین احمد خاں نیّر جیسے کہ آگے چل کر غالب نے خود واضح کر دیا ہے۔

ان دنوں میں ایک بنیا پڑھا لکھا حرف شناس، کوئی فلاں ناتھ، ڈھمک داس ہے۔ مَیں بالاخانہ میں رہتا ہوں۔ حویلی میں آکر اُس نے دارو غہ کو خط دے کر مجھ سے کہا ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ کو جیسا کہ ..ّی کے بادشاہ نے "نوابی" کا خطاب دیا تھا، اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران کہ یہ کیا کہتا ہے۔ سرنامہ کو غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم "مخدوم نیاز مند بیتاب" لکھا تھا۔ اس قرق ساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے "کیشان" کو "کپتان" پڑھا۔

بھائی ضیاء الدین خاں صاحب شملہ گئے ہُوئے ہیں۔ شاید ماہ حال یعنی جولائی یا اول ماہ آیندہ یعنی اگست میں یہاں آجائیں۔ آپ کو نوید تخفیف تصدیع دیتا ہوں آپ نواب صاحب سے کتاب کیوں مانگیں اور زحمت کیوں اُٹھائیں؟ جس قدر کہ علم ان کو اس خاندان مجدت نشان کے حال پر حاصل ہو گیا ہے، کافی ہے۔ مولانا قلق کے نام کی عرضی ان کو پہنچا دیجیے گا اور جناب نادر حسین خاں صاحب کو میرا اسلام فرما دیجیے گا۔

(۱۵)

خداوند نعمت

شرف افزا نامہ پہنچا۔ شاہ اسرار الحق کے نام کا مکتوب ان کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ جناب شاہ صاحب سالک مجذوب یا مجذوب سالک ہیں۔ اگر جواب بھجوا دیں گے تو جناب میں ارسال کر دیا جائے گا۔ قصیدے کو بارہا دیکھا اور غور کی۔ جس طرح پر ہے، اس میں گنجایش اصلاح کی نہ پائی یعنی لفظ کی جگہ لفظ مرادف بالمعنی لانا صرف اپنی دستگاہ کا اظہار ہے، ورنہ کوئی لفظ بے محل اور بے موقع نہیں۔ کوئی ترکیب فارسی ٹکسال سے باہر نہیں، مگر ہاں طرز گفتار کا بدلنا، اس کے واسطے چاہیے

دوسرا قصیدہ اس زمین میں ایک اور لکھنا اور وہ تکلف بارد ہے، بلکہ شاید حضرت کو یہ منظور بھی نہ ہو۔ پس شرم کم خدمتی سے دل ریش اور فرط خجلت سے سر در پیش ہو کر قصیدہ اس لفافے میں بھیجتا ہوں۔ خدا کرے مورد عتاب نہ ہوں۔ غلّہ کی گرانی، آفتِ آسمانی امراض دموی، بلائے جانی۔ انواع و اقسام کے اورام و بثور شائع، چارہ ناسود مند و سعی ضائع۔ میں نہیں جانتا کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو پہر دن چڑھے وہ فوج باغی میرٹھ سے دلّی آئی تھی یا خود قہر الٰہی کا پے بہ پے نزول ہوا تھا۔ بقدر خصوصیت سابق دلّی ممتاز ہے، ورنہ سرتاسر قلمرو ہند میں فتنہ و بلا کا دروازہ باز ہے۔ اِنّا لله و انا الیہ راجعون۔

جناب میر امجد علی صاحب کو بندگی۔ جناب منشی نادر حسین خاں صاحب کو سلام۔

مرقومہ سحرگاہ آدینہ ۲۴ ماہ اگست ۱۸۶۰ء

(۱۶)

پیر و مرشد،

جب آپ کا بندۂ فرمانبردار اور آپ کا حکم بطیب خاطر بجا لاتا ہوں، مگر سمجھ تو لوں کہ کیا لکھوں؟ وہ مکتوب کہاں بھیجوں؟ آپ کے پاس بھیج دوں یا انھیں منشی صاحب کے پاس بھیج دوں؟ اور وسیم الدین اور ظہیر الدین کو منشی، میر، شیخ، خواجہ، کیا کر کے لکھوں؟ وہ حاکم کی رائے کے شمول کا قیدی اور اس زمانے میں دریائے شور کو بھیجا جاتا ہے جس زمانے میں سینکڑوں جزیرہ نشیں رہائی پا کر اپنے اپنے گھر آ گئے۔ ہاں ہمہ منشی کو کیا اختیار ہے کہ وہ چھوڑ دے۔ کہ اب سعی منحصر اس میں ہے کہ قیدی دریائے شور کو نہ جاوے اور یہیں محبوس رہے یا یہ منظور ہے کہ جزیرہ کو بھی نہ جاوے اور یہاں کی قید سے بھی رہائی پائے؟ خواہش کیا ہے اور کارپرداز سے

سے کس طرح کی اعانت چاہوں؟ پہلے تو یہ سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں اس کو کہاں بھیجوں؟ طریق یہ ہے کہ میاں امیرالدین وہ نگارش لے کر منشی صاحب کے پاس جائیں اور بذریعہ اس خط کے روشناس ہوں۔ میں کیا جانوں کہ امیرالدین کا مسکن کہاں ہے؟ منشی صاحب کو خط بھیج دوں، اُن کے نزدیک احمق بنوں کہ کس امرِ موہوم مجہول میں مجھ کو لکھا ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس خط کو پڑھ کر تفحص کریں کہ امیرالدین کون ہے اور کہاں سے اور کیا چاہتا ہے؟ بہ ہر حال اس خط کے ساتھ ایک اور لفافہ آپ کے نام کا روانہ کرتا ہوں۔ اس میں صرف ایک خط موسومہ منشی صاحب سے ہے کھلا ہوا۔ اس کو پڑھ کر میاں امیرالدین کے پاس بھیج دیجیے گا، مگر گوند لگا کر۔ اور اگر یہ منظور نہ ہو تو میری طرف سے منشی صاحب کے نام کے خط کا مسودہ لکھ کر میرے پاس بھیجیے اور لکھ بھیجیے کہ اس مسودہ کو صاف کر کے کہاں بھیجوں۔

صبح یک شنبہ ۲۔ جون ۱۸۶۱ء

(۱۷)

قبلہ و کعبہ،

کیا لکھوں؟ امورِ نفسانی میں اضداد کا جمع ہونا محالاتِ عادیہ میں سے ہے۔ کیوں کر ہو سکے ایک وقتِ خاص میں ایک امرِ خاص موجبِ انشراح کا بھی ہو اور باعثِ انقباض کا بھی ہو۔ یہ بات میں نے آپ کے اس خط میں پائی کہ اس کو پڑھ کر خوش بھی ہوا اور غمگین بھی ہوا۔ سبحان اللہ! اکثر امور میں تم کو اپنا ہم طالع پاتا ہوں۔ عزیزوں کی ستم کشی اور رشتہ داروں سے ناخوشی۔ میرا ہم قوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں۔ سمرقند میں دو چار، یا دشت خنچاق میں سو دو سو ہوں گے۔ مگر ہاں اقربائے سببی ہیں۔ سو پانچ برس کی عمر سے ان کے دام میں اسیر ہوں۔ اکسٹھ برس ستم اُٹھائے ہیں:

گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب — رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

نہ تم میری خبر لے سکتے ہو، نہ میں تم کو مدد دے سکتا ہوں۔ اللہ، اللہ، اللہ! دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے، دو ہاتھ لگائے، بیڑا پار ہے:

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

شاہ اسرار الحق کو حافظ نظام الدین صاحب کا خط بھجوا دیا۔ ہفتہ بھر کے بعد جواب مانگا۔ جواب دیا کہ اب بھیجتا ہوں۔ دس بارہ دن ہوئے کہ حضرت خود تشریف لائے۔ جواب آپ کے اور حافظ جی کے خط کا مانگا، کہا کہ کل بھیج دوں گا۔ اس واقعہ کو قریب دو ہفتے کے عرصہ ہوا۔ ناچار اُن کے جواب سے قطع نظر کر کے آپ کو یہ چند سطریں لکھیں:

از خون دل نوشتم نزدیک دوست نامہ — انی رایت دہراً فی ہجرک القیامہ

حافظ جی صاحب کو میری بندگی کہیے گا اور یہ خط ان کو پڑھوا دیجیے گا۔ جناب منشی نادر حسین خاں صاحب کو میرا سلام پہنچے۔ اگرچہ آپ مبتلائے رنج و الم ہو، مگر یہ شرف کیا کم ہے کہ انوار الدولہ کے ہمدرد ہو۔ مورد ستمہائے روزگار ہونا شرافت ذاتی کی دلیل ہے ساطع، اور برہان ہے قاطع۔ ہاں حضرت بہت دن سے جناب میر امجد علی صاحب کا کچھ حال معلوم نہیں۔ ان کے تخلص[1] نے مجھ کو حیران کر رکھا ہے یعنی قلق میں مبتلا ہوں۔ آپ ان کا حال لکھیے۔ خواجہ اسماعیل خاں صاحب کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟ سنیے قبلہ، میں تو آپ سے شاہ انوار الحق کے خط کے جواب کا طالب نہیں ہوں کہ آپ ان کے خط کے حاصل ہونے کے انتظار میں مجھ کو خط نہ لکھ سکیں۔ مترصد ہوں کہ اس اپنے خط کا جواب جلد پاؤں۔

صبح سہ شنبہ ۲۲۔ اکتوبر ۱۸۶۱ء — جواب کا طالب غالب

---

[1] میر امجد علی کا تخلص قلق تھا۔

(۱۸)

ناوک بیداد کا ہدف، پیر خرف یعنی غالب آداب بجا لاتا ہے۔ نوازش نامے کو دیکھ کر جانا کہ مَیں نے "کمرے چند" کے شعر پر خط بطلان کھینچ دیا۔ یہ تو کوئی گمان نہ کرے گا کہ مَیں کمر کو کمر بند نہیں جانتا۔ معہذا وہاں پہلے مصرع میں اگر "کمر" بمعنی "کمر بند" فرض کیجیے تو بھی تو شعر کاٹ ڈالنے کے قابل نہیں۔ قصد کر کے بیٹھا تھا کہ اس شعر پر صاد کروں گا، خدا جانے قلم سے خط کیوں کر کھینچ گیا۔ اب حواس بجا نہیں، حافظہ رہا نہیں۔ اکثر الفاظ بے قصد لکھ جاتا ہوں، ستر برس کی عمر ہوئی، کہاں تک خرافت نہ آئے۔ اس شعر کا گنہگار اور حضرت سے شرمسار ہوں معاف کیجیے۔ زیادہ حد ادب۔

(۱۹)

پیر و مرشد،

آداب، غلط نامہ، "قاطع برہان" کو بھیجے ہوئے تین اور آپ کی خیر و عافیت مولوی حافظ عزیز الدین کی زبانی سُنے ہوئے دو دن ہوئے تھے کہ کل آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ "قاطع برہان" کے پہنچنے سے اطلاع پائی۔ معتقدان "برہان قاطع" برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہنوز دو اعتراض مجھ تک پہنچے ہیں: ایک ایک تو یہ کہ "قاطع برہان" غلط ہے یعنی ترکیب خلاف قاعدہ ہے۔ کلام قطع کیا جاتا ہے، برہان قطع نہیں ہو سکتی ہے۔ لو صاحب، برہان قاطع صحیح اور قاطع برہان غلط! مگر برہان قطع کی فاعل ہو سکتی ہے اور قطع کا فعل آپ نہیں قبول کرتی۔ "قاطع برہان" میں جو برہان کا لفظ ہے یہ مخفف "برہان قاطع" ہے۔ "برہان قاطع" کے رد کو قطع سمجھ کر "قاطع برہان" نام رکھا تو کیا گناہ ہوا؟ دوسرا ایراد یہ ہے: مصرع

با انگلسیان ستیز بے جا

انگلس کا نون تلفظ میں نہیں آتا۔ مَیں پوچھتا ہوں خدا کے واسطے "انگلس" اور

"انگریز" کا نون باعلان کہاں ہے اور اگر ہے بھی تو ضرورت شعر کے واسطے لغات عربی میں سکون و حرکت کو بدل ڈالتے ہیں، اگر انگلس کے نون کو غنہ کر دیا تو کیا گناہ ہوا؟

وہ ورق جو چھاپے کا آپ کے پاس بھیجا ہے اُس کو غلط نامہ شامل کے بعد لگوا کر جلد بندھوا لیجیے گا۔

حضرت، کیوں آپ نے مراسلے اور میرے مکتوب کا حال پوچھا:

ایں ہم کہ جوابے نہ نویسند جواب است

سمجھ لو اور چپ رہو۔ مَیں نے مانا جس کو تم نے لکھا ہے، وہ لکھے گا کہ مَیں نے مختار سے پوچھا۔ اس نے یوں کہا، پھر میں نے یوں کہا۔ اب یہ بات قرار پائی ہے۔ تو اس تقریر کو حضرت ہی باور کریں گے، فقیر کبھی نہ مانے گا۔

ایک حکایت سنو۔ امجد علی شاہ کی سلطنت کے آغاز میں، ایک صاحب، میرے نیم آشنا یعنی خدا جانے کہاں کے رہنے والے کسی زمانے میں وارد اکبر آباد ہوئے تھے، کبھی کہیں کے تحصیلدار بھی ہو گئے تھے۔ زبان آور اور چالاک۔ اکبر آباد میں نوکری کی جستجو کی، کہیں کچھ نہ ہوا۔ میرے ہاں دو ایک بار آئے تھے، پھر وہ خدا جانے کہاں گئے۔ میں دلی میں آ رہا۔ کم و بیش بیس برس ہوے ہوں گے۔ امجد علی شاہ[1] کے عہد میں ان کا خط ناگاہ مجھ کو بسبیل ڈاک آیا۔ چونکہ ان دنوں میں دماغ درست اور حافظہ برقرار تھا۔ مَیں نے جانا کہ یہ وہی بزرگوار ہیں۔ خط میں پہلے مجھ کو یہ مصرع لکھا:

از بخت شکر دارم واز روزگار ہم

آپ سے جُدا ہو کر بیس برس آوارہ پھرا۔ جے پور میں نوکر ہو گیا۔ وہاں سے دو برس کے بعد کہاں گیا اور کیا کیا۔ اب لکھنؤ میں آیا ہوں، وزیر سے ملا ہوں۔ بہت

---

[1] فرمانروائے اودھ

عنایت کرتے ہیں۔ بادشاہ کی ملازمت انھیں کے ذریعے حاصل ہوئی ہے، بادشاہ نے "خان" اور "بہادر" کا خطاب دیا ہے۔ مصاحبوں میں نام لکھا ہے۔ مشاہرہ ابھی قرار نہیں پایا۔ وزیر کو میں نے آپ کا بہت مشتاق کیا ہے۔ اگر آپ کوئی قصیدہ حضور کی مدح میں اور عرضی یا خط جو مناسب جانیں، وزیر کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دیجیے تو بے شک بادشاہ آپ کو بلائیں گے اور وزیر کا خط فرمان طلب آپ کو پہنچے گا۔ میں نے اسی عرصے میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کی بیت اسم یہ ہے:

امجد علی شہ آنکہ بہ ذوق دعاے او　　صدرہ نماز صبح قضا کرد روزگار

متردد تھا کہ کس کی معرفت بھیجوں۔ توکلت علی اللہ بھیج دیا۔ رسید آگئی صرف۔ پھر دو ہفتے بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک پہنچا، وزیر پڑھ کر بہت خوش ہوا، بہ آئین شایستہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ میں متوقع ہوں کہ میاں بدرالدین مہر کن سے میری مہر خطابی کھدوا کر بھیج دیجیے۔ چاندی کا نگینہ ہو مربع اور قلم جلی۔ فقیر نے سرانجام کر کے بھیج دیا۔ رسید آئی اور قصیدے کی بادشاہ تک گزرنے کی نوید۔ بس پھر دو مہینے تک اُدھر سے کوئی خط نہ آیا۔ میں نے جو خط بھیجا، اُلٹا پھر آیا۔ ڈاک کا یہ توقیع، کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں۔ ایک مدت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اس بزرگ کا وزیر تک پہنچنا اور حاضر رہنا سچ، بادشاہ کی ملازمت اور خطاب ملنا غلط بہادری کی مُہر تم سے بہ فریب حاصل کر کے مرشد آباد کو چلا گیا۔ چلتے وقت وزیر نے دو سو روپے دیئے تھے۔

ایک قاعدہ کلیہ دلی کا سمجھ لو۔ خالق کی قدرت مقتضی اس کی ہے کہ جو اس شہر پناہ کے اندر پیدا ہوا، مرد یا عورت، خفقان و مراق، اس کی خلقت و فطرت میں ہو۔ آٹھ دس برس کے بعد ساون کے آخر میں مینہ برسا، لیکن نہ دریا جاری ہوئے نہ طوفان

آیا۔ ہاں شہر کے باہر ایک دن بجلی گری۔ دو ایک آدمی، کچھ جانور تلف ہوئے، مکان گرے، دس بیس آدمی دب کر مرے، دو تین آدمی کوٹھے پر سے گر کر مرے۔ مراقیوں نے غل مچانا شروع کیا۔ اپنے اپنے عزیزان بسفر رفتہ کو لکھا۔ جابجا اخبار نویسوں نے اُن سے سُن کر درج اخبار کیا۔ لو، اب دس بارہ دن سے مینہ کا نام نہیں۔ دھوپ آگ سے زیادہ تر تیز ہے۔ وہی خفقانی صاحب روتے پھرتے ہیں کہ کھیتیاں جلی جاتی ہیں۔ اگر مینہ نہ برسے گا تو پھر کال پڑے گا۔ مکانات کے گرنے کا حال یہ ہے کہ چار پانچ برس منضبط رہے یغمائی لوگ لکڑی تختہ، کواڑ، چوکھٹ بعض مکان کی چھت کا مسالا، سب لے گئے۔ اب اُن غربا کو وہ مکان ملے تو ان میں مرمت کا مقدور کہاں؟ فرمایئے مکانات کیوں کر نہ گریں؟

(۲۰)

پیر و مرشد،

آداب۔ مزاج مقدس۔ میرا جو حال آپ نے پوچھا، اس پرسش کا شکر بجا لاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ آپ کا بندۂ بے دام و درم خریدہ اچھی طرح ہے۔ ایک فصد، بائیس منضج، چار مسہل، کہاں تک آدمی کو ضعیف نہ کرے۔ بارے آفتاب عقرب میں آگیا، پانی برخاب ہو گیا ہے۔ کابل و کشمیر کا میوہ بکنے لگا ہے۔ یہ ضعف، ضعف قسمت تو نہیں کہ ایسے ایسے امور اس کو زائل نہ کر سکیں۔

غزلوں کو پرسوں سے پڑھ رہا ہوں اور وجد کر رہا ہوں۔ خوشامد میرا شیوہ نہیں ہے۔ جو ان غزلوں کی حقیقت میری نظر میں ہے، وہ مجھ سے سُن لیجیے اور میرے داد دینے کی داد دیجیے۔ مولانا قلق نے متقدمین یعنی امیر خسرو و سعدی و جامی کی روش کو سر حد کمال پر پہنچایا ہے اور میرے قبلہ و کعبہ مولانا شفق اور مولانا ہاشمی اور مولانا عسکری متاخرین یعنی صائب و کلیم و قدسی کے انداز کو آسمان پر لے گئے ہیں۔ اگر تکلف و تملق

سے کہتا ہوں، تو مجھ کو ایمان نصیب نہ ہو۔ یہ جو آپ اپنے کلام کے حک و اصلاح کے واسطے مجھ سے فرماتے ہیں، یہ آپ میری آبرو بڑھاتے ہیں۔ کوئی بات بیجا ہو، کوئی لفظ ناروا ہو، تو مَیں حکم بجالاؤں۔ زیادہ حد ادب۔

(۲۱)

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خداوند نعمت،

آج دو شنبہ ۶۔ رمضان کی اور ۱۵۔ فروری کی ہے۔ اس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں عطوفت نامہ پہنچا۔ اُدھر پڑھا اِدھر جواب لکھا۔ ڈاک کا وقت نہ رہا۔ خط کو معنون کر رکھتا ہوں کل شنبہ ۱۶۔ فروری کو ڈاک میں بھجوا دوں گا۔ سال گزشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا۔ بارہ تیرہ مہینے صاحبِ فراش رہا۔ اُٹھنا دشوار تھا چلنا پھرنا کیسا؟ نہ تپ، نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ، ان سب سے بدتر ایک صورت پُر کدورت، یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے، ہر پھوڑا ایک زخم، ہر زخم ایک غار، ہر روز بے مبالغہ بارہ تیرہ پھاہے اور پاؤ بھر مرہم درکار۔ نو دس مہینے بے خور و خواب رہا ہوں اور شب و روز بیتاب۔ راتیں یوں گزری ہیں، کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی، دو گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اُٹھی۔ جاگ اٹھا، تڑپا کیا، پھر سو گیا، پھر ہوشیار ہو گیا سال بھر میں سے تین حصے دن یوں گزرے، پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے میں لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سر سے رُوح قالب میں آئی، اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اب اگرچہ تندرست ہوں لیکن ناتوان و سُست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا، حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اُٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اُٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں ایک قدِ آدم دیوار اُٹھے۔ آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں، کہ جب تک

میرا مرنا نہ سُنا، میری خبر نہ لی۔ میری مرگ کے مخبر کی تقریر اور مثلاً میری یہ تحریر آدھی سچ اور آدھی جھوٹ۔ در صورتِ مرگ نیم مردہ اور در حالتِ حیات نیم زندہ ہوں:

درکشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
اینکہ من تے میرم ہم زنا توانیہاست

اگر ان سطور کی نقل میرے مخدوم مولوی غلام غوث خاں صاحب بہادر میر منشی لفٹنٹ گورنری غرب و شمال کے پاس بھیج دیجیے گا تو ان کو خوش اور مجھ کو ممنون کیجیے گا۔

دوشنبہ ۶۔ رمضان سنہ ۱۲۸۰ھ ، ۱۵۔ فروری سنہ ۱۸۶۴ء

حکیم غلام نجف خاں و ظہیر الدین احمد خاں

عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کے اقربا میں سے تھے۔ حکیم محمود خاں شریف خانی کے والد ماجد سے طبابت کی تعلیم پائی۔ حکیم احسن اللہ خاں کے زیر نگرانی مشق بہم پہنچائی۔ یہ اصل میں شیخو پور (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں کی وجہ سے دہلی میں اقامت پذیر ہوئے۔ غالب ان کے ساتھ گھر کے افراد کا سا برتاؤ کرتے تھے۔

غدر کے وقت یہ دوجانے میں تھے اور خط و کتابت کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی۔ پھر دہلی آ گئے تو خط و کتابت کی ضرورت نہ رہی۔ اقامت دہلی کے زمانے کا صرف ایک خط میرے علم میں آیا ہے (ملاحظہ ہو خط ۱۴) جس میں چاولوں کا ذکر ہے۔ پھر چند خطوط اس زمانے کے ہیں، جب میرزا پہلی اور دوسری دفعہ رام پور گئے تھے

حکیم ظہیر الدین احمد خاں، حکیم غلام نجف خاں کے صاحبزادے تھے۔ ان کے

نام صرف ایک خط ہے۔ دوسرا خط ان کی طرف سے ان کے چچا کو لکھا گیا ہے۔

(۱)

میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔ نکالا نہیں گیا۔ لٹا نہیں۔ کسی محکمہ میں اب تک بُلایا نہیں گیا۔ معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آیندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

شبیر زماں خاں نے مجھے آگرہ سے خط لکھا اس میں ایک رقعہ تھا شیخ نجم الدین حیدر[1] صاحب کی طرف سے بنام ظہیر الدین[2] کے۔ اب مجھ کو ضرور آ پڑا کہ اس کو تمھارے پاس بھیجوں۔ آدمی کوئی ایسا نظر نہ چڑھا، ناچار بطریق ڈاک بھیجتا ہوں۔ اگر پہنچ جائے تو آگرے کا جواب لکھ کر میرے پاس بھیج دینا، میں یہاں سے آگرہ کو روانہ کر دوں گا۔

مرسلہ دوشنبہ چہارم جمادی الاول ۱۲۷۴ھ

مطابق ۲۱۔ دسمبر ۱۸۵۷ء جواب طلب غالب

(۲)

میاں تمھارا خط پہنچا۔ آج میں نے اس کو اپنے خط میں ملفوف کر کے آگرے کو روانہ کیا۔ تم جو کہتے ہو کہ تم نے کبھی مجھ کو خط نہیں لکھا اور اگر شیخ نجم الدین حیدر کا خط نہ آتا، تو اب بھی نہ لکھتے۔ انصاف کرو، لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟ تم نے جو مجھ کو لکھا تو کیا لکھا اور اب جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں۔ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے، نہ میں لکھوں گا۔ ظہیر الدین کو دعا کہنا اور میری طرف سے پیار کرنا۔ تم کو اور ظہیر الدین

---

[1] یہ غالباً حکیم غلام نجف خاں کے رشتہ دار تھے۔

[2] حکیم غلام نجف خاں کے فرزند۔

کو اور اس ماں کو اور اس کی بہن کو اور اس کی لڑکی کو تمھاری ماں[1] دعا کہتی ہے اور دعائیں دیتی ہے۔ یہ رقعہ حیدر حسن خاں کے نام کا ہے' ان کو حوالے کر دینا۔

نگاشتہ شنبہ ۲۶۔ دسمبر ۱۸۵۷ء اسداللہ

(۳)

سعادت و اقبال نشان حکیم غلام نجف خاں طال بقاوہٗ۔ تمھارا رقعہ پہنچا۔ جو دم ہے' غنیمت ہے۔ اس وقت تک میں مع عیال و اطفال جیتا ہوں' بعد گھڑی بھر کے کیا ہو۔ قلم ہات میں لیے بڑی ہمت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے' تو کہہ لیں گے' ورنہ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ نواسی کا حال معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اس کی ماں کو صبر دے اور زندہ رکھے۔ میں یوں سمجھتا ہوں کہ یہ چھوکری قسمت والی تھی۔ تمھاری اُستانی[2] تم کو اور ظہیرالدین کو اور اس کی ماں کو اور اس کی بہن کو دعا کہتی ہیں اور میں پیار کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں۔

سہ شنبہ ۱۹۔ جنوری ۱۸۵۸ء غالب

(۴)

بھائی'

ہوش میں آؤ۔ میں نے تم کو خط کب بھیجا اور رقعہ میں کب لکھا کہ شیر زماں کا خط تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ میں نے تو ایک لطیفہ لکھا تھا کہ شیر زماں خاں نے میرے خط میں بندگی لکھی تھی۔ اور میں وہ بندگی اس رقعہ میں لپیٹ کر تم کو بھیجتا ہوں بس بات اتنی ہی تھی۔ وہ بندگی لکھی ہوئی گویا لپٹی ہوئی تھی' سو حضرت کو پہنچ گئی۔ خاطر عاطر جمع رہے۔

---

[1] بیگم غالب

[2] استانی ۔۔۔ سے بھی اشارہ بیگم صاحب کی طرف ہے' جسے پہلے ماں لکھا تھا۔

(۵)

میاں،

تم کو مبارک ہو کہ حکیم[1] صاحب پر سے وہ سپاہی جوان کے اوپر متعین تھا اٹھ گیا
اور ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو۔ مگر شہر میں رہو، باہر جانے کا اگر قصد کرو تو
پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتہ میں ایکبار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔ چنانچہ وہ کچے باغ کے
پچھواڑے مرزا جاگن کے مکان میں آ رہے ہے۔ صفدر میرے پاس آیا تھا، یہ اس کی
زبانی ہے۔ جی ان کے دیکھنے کو چاہتا ہے، مگر از راہ احتیاط جا نہیں سکتا۔
مرزا بہادر بیگ نے بھی رہائی پائی۔ اب اس وقت سنا ہے کہ وہ خاں صاحب
کے پاس آئے ہیں۔ یقین ہے کہ بعد ملاقات باہر چلے جائیں گے، یہاں نہ رہیں گے
قدم شریف میں وہ رہتے ہیں۔
آج پانچواں دن ہے کہ حکیم محمود خاں مع قبائل و عشائر پٹیالہ کو گئے ہیں۔
بمقتضائے وقت اپنی سکونت کے مکان چھوڑ کر یہاں آ رہا ہوں، اس طرح کہ محل سرا
میں زنانہ اور دیوان خانہ میں مردانہ۔
پنسن کی درخواست کا ابھی کچھ حکم نہیں معلوم ہوا۔ کلکٹر سے کیفیت طلب ہوئی
ہے۔ دیکھئے بعد کیفیت کے جانے کے پنسن ملتا ہے یا جواب۔
پنجشنبہ ۱۶۔ شعبان ۱۲۷۴ھ مطابق یکم اپریل ۱۸۵۸ء

(۶)

بھائی،

میرا ذکر سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے

---

[1] غالباً حکیم احسن اللہ خاں۔

نفور ہے، ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے۔ مَیں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں ایک سبکی اور ذلّت تھی، اگرچہ مجھ کو دولت تنہائی میسّر آجاتی۔ لیکن اس تنہائی چند روزہ اور تجرید مستعار کی کیا خوشی؟ خدا نے لاولد رکھا تھا، شکر بجا لاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر مقبول و منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے، یعنی جس لوہے کا طوق، اسی لوہے کی دو ہتکڑیاں بھی پڑ گئیں[1]۔ خیر اس کا کیا رونا ہے، یہ قید جاودانی ہے۔

جناب حکیم[2] صاحب ایک روز از راہِ عنایت یہاں آئے۔ کیا کہوں کہ ان کے دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا ہے۔ خدا ان کو زندہ رکھے۔ خصوصاً اس فتنہ و آشوب[3] میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچا ہوگا۔ اس راہ سے مجھ کو جو دوست اب باقی ہیں بہت عزیز ہیں۔ واللہ دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔

مصطفیٰ خاں[4] کا حال سنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے، ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں۔ احمد حسین میکش کا حال کچھ تم کو معلوم ہے یا نہیں؟ مخنوق[5] ہوا، گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔

پنسن کی درخواست دے رکھی ہے۔ بشرط اجرا بھی میرا کیا گزارہ ہوگا؟ ہاں دو باتیں ہیں: ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بیگناہی کی دلیل ہے[6]، دوسرے یہ کہ موافق

---

[1] بیگم کو طوق اور زین العابدین خاں عارف کے بچّوں کو ہتکڑیاں قرار دیا ہے۔
[2] حکیم احسن اللہ خاں۔
[3] "غدر" ۱۸۵۷ء
[4] نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔
[5] یعنی پھانسی پائی [6] مطلب یہ کہ پنشن اگرچہ چھوٹی ہی لیکن مل جائے تو میری بے گناہی کا ثبوت ہوگی۔

قولِ عوام "چوٹھے دلدّر نہ ہوگا"۔ تجھ کو میری جان کی قسم، اگر میں تنہا ہوتا تو اس وجہ قلیل میں کیسا فارغ البال اور خوشحال رہتا۔ یہ بھی خبط ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ خدا جانے پنشن جاری ہوگا یا نہ ہوگا۔ احتمالِ تعیش و تنعم بشرط تجرید صورتِ اجرائے پنشن میں سوچتا ہوں اور وہ موہوم ہے۔ بیدل کا شعر مجھ کو مزا دیتا ہے:

نہ شام ما را سحر نویدی، نہ صبح ما را دمِ سپیدی
چو حاصلِ ماست ناامیدی، غبارِ دنیا بفرقِ عقبیٰ

اس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا، جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا۔ زیادہ کیا لکھوں
اپریل ۱۸۵۸ء

(۷)

میاں،

پہلے ظہیر الدین کا حال لکھو، پھر حکیم صاحب کی حقیقت لکھو۔ کہیں اور جائیں گے یا یہاں آئیں گے؟ اگر یہاں آئیں گے تو کب تک آئیں گے؟ پھر تم خط لکھو میاں نظام الدین کو اور اس میں لکھو کہ تم نے غالب کے خط کا جواب نہیں لکھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں حیران کہ میاں نظام الدین اور میرے خط کا جواب نہ لکھیں! خدا جانے مجھ سے ایسی کیا تقصیر ہوئی ہے۔ نجات کا خدا سے اور تم سے اس رقعہ کے جواب کا طالب

۱۸۵۸ء   غالب

(۸)

بھائی،

تمھارے رقعے کا جواب پہلے تم کو شیر زماں خاں نے دیا ہوگا، پھر ظہیر الدین خاں نے تم سے کہا ہوگا۔ کہو کوئی طرح شہر میں تمھارے آنے کی ٹھہری یا نہیں؟ بعد

تیس کوس اور آدھ کوس کا برابر ہے۔ میری جان، تم ہنوز دو جانے میں ہو۔ مجھ کو تم جانتے ہو کہ میرا شہر میں رہنا بے جازت سرکار کے نہیں اور باہر نکلنا بے ٹکٹ نہیں۔ پھر میں کیا کروں؟ کیوں کر وہاں آؤں؟ شہر میں تم ہوتے تو جُراُت کرکے تمھارے پاس چلا آتا۔ شبیر زماں خاں صاحب ایک بار آئے تھے، کہہ گئے تھے کہ پھر بھی آؤں گا، مگر نہیں آئے۔ خدا جانے ان کے والد کی رہائی ہوئی یا نہیں۔ اگر تم سے ملیں تو میرا سلام کہنا اور ان کو میرے پاس بھیج دینا اور تم کو ان کے والد کا جو حال ان کی زبانی معلوم ہوا ہو وہ مجھ کو لکھ بھیجو۔ ظہیرالدین کو دعا۔

جولائی ۱۸۵۸ء   از غالب

۹

بھائی،

ہاں غلام فخرالدین خاں[1] کی رہائی زندگی دوبارہ ہے۔ خدا تم کو مبارک کرے۔ سُنا ہے لوہارو بھی اُن دونوں صاحبوں[2] کو مل گیا۔ یہ بھی ایک تہنیت ہے۔ خدا سب کا بھلا کرے۔ مجھ کو صاحب ڈپٹی کمشنر نے بُلا بھیجا تھا۔ صرف اتنا ہی پوچھا کہ "غدر" میں تم کہاں تھے؟ جو مناسب ہُوا، وہ کہا گیا۔ دو ایک خط آمدہ ولایت مَیں نے پڑھائے۔ تفصیل لکھ نہیں سکتا۔ انداز و ادا سے پنشن کا بحال و برقرار رہنا معلوم ہوتا ہے؟ خُدا خیر کرے۔ واسطے خدا کے جو تم کو معلوم ہوا ہو اور جو معلوم ہو جاوے، اس سے مجھ کو بھی اطلاع دینا۔

اگست ۱۸۵۸ء   غالب

---

[1] غالب کے برادر نسبتی میرزا علی بخش خاں رنجور کے فرزند اور غالب کی بھتیجی کے شوہر
[2] امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں۔

(۱۰)

از غالبؔ بنام جان و جاناں و از جان و جاناں عزیز تر، حکیم غلام نجف خاں سلمہ اللہ تعالیٰ

قبلہ،

یہ تو معلوم ہُوا کہ بعد قتل ہونے دس آدمی کے، کہ دو اس میں عزیز بھی تھے، یہ سب وہاں سے نکالے گئے، مگر صورت نہیں معلوم کہ کیوں کر نکلے، پیادہ یا سوار؟ تہی دست یا مالدار؟ مستورات کو تو رتھیں دے دی تھیں، ذکور کا حال کیا ہُوا، اور پھر وہاں سے نکلنے کے بعد کیا ہُوا؟ کہاں رہے اور کہاں رہیں گے؟ سرکار انگریزی کی طرف سے مورد تفقد و ترحم ہیں یا نہیں؟ رنگ کیا نظر آتا ہے؟ جبرِ کسر کی توقع ہے یا نہیں؟ تفضل حسین خاں کا حال خصوصاً اور ان سوالات کا جواب عموماً[۱] لکھو۔

میرزا مغل میرا حقیقی بھانجا کہ وہ منشی خلیل الدین خاں مرحوم کا خویش ہے، اس کی بی بی ہے اور شاید ایک یا دو بچے بھی ہیں، از غائب ہے یہ امر کہ وہ بھی قافلہ کے

۱۔ یہ الور کے ہنگامے کی تفصیل ہے۔ جس کے متعلق خط ۹ میں استفسار کیا گیا تھا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امین اللہ خاں عرف اموجان وہاں مختار بن گیا تھا اور اس نے اپنے منجھلے بھائی فضل اللہ خاں کو نائب دیوان اور چھوٹے بھائی انعام اللہ خاں کو فوج کا بخشی مقرر کر دیا تھا۔ اموجان نے راجا دھیان سنگھ کی والدہ کو بہن بنا لیا تھا۔ ایک اور صاحب اسفندیار جنگ نے راجپوتوں کو اکسایا۔ ایک ٹھا کرنے رات کے وقت امین اللہ خاں کے مکان پر حملہ کر دیا۔ دیوان کا ایک بیٹا اور دو متعلق مارے گئے۔ اور تینوں بھائی قید ہو گئے پھر راجا نے انھیں چھڑا کر دہلی بھجوا دیا۔

کے ساتھ ہوگا۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو اس کا حال بانفراد لکھیے[۱]۔ خواجہ جان اور خواجہ امان[۲] کی حقیقت بھی بشرط اطلاع ضروری فرمائیے۔ اور ہاں صاحب آپ جانتے ہوں گے علی محمد خاں کو، وہ جو میر منشی عزیز اللہ خاں کا خویش ہے، اگر کچھ اس کا ذکر بھی سُنا ہو تو مَیں اس کا خیر طلب ہوں۔

اپریل ۱۸۵۸ء   غالب جواب طلب

(۱۱)

میاں،

میں تم سے رخصت ہو کر اس دن مرادنگر میں رہا۔ دوسرے دن یعنی جمعے کو میرٹھ پہنچا۔ نواب مصطفیٰ خاں نے ایک دن رکھ لیا۔ آج شنبہ ۲۱ جنوری یہاں مقام ہے۔ نو بج گئے ہیں۔ بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مفت کا کھانا ہے، خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔ کل شاہ جہان پور، پرسوں گڑھ مکیسر رہوں گا۔ مراد آباد سے پھر تم کو خط لکھوں[۳] گا۔ لڑکوں[۴] کے ہاتھ کے دو خط لکھے ہوئے ان کی دادی[۵] کو بھجوا دیئے ہیں۔ تم اس اپنے نام کے

---

[۱] مرزا مغل کا نام جواد علی بیگ تھا، یہ غالب کی بہن چھوٹی خانم کا لڑکا تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے جن میں سے آغا میرزا بیگ نے بڑا رتبہ پایا اور میر محبوب علی خاں مرحوم نظام دکن کا اُستاد بن گیا۔ سرور الملک خطاب ملا۔ نواب ذوالقدر جنگ اس کا فرزند تھا۔ آغا میرزا بیگ نے اپنے سوانح حیات خود لکھے جو کارنامہ سروری کے نام سے چھپے۔

[۲] خواجہ جان اور خواجہ امان خواجہ حاجی کے فرزند تھے جسے میرزا غالب اپنے دادا کا سائیس بتاتے ہیں۔ خواجہ حاجی ہی تھا جسے نواب احمد بخش خاں مرحوم نے غالب کی خاندانی پنشن میں سے دو ہزار روپے سالانہ دلاتے تھے۔

[۳] یہ پہلے سفر رام پور کی کیفیت ہے

[۴] باقر علی خاں اور حسین علی خاں فرزندانِ عارف۔

[۵] بیگم غالب

خط کو لے کر ڈیوڑھی[1] پر جانا اور استانی جی[2] کو پڑھ کر سنا دینا اور خیر و عافیت کہہ دینا۔ جناب خاں صاحب کو میرا سلام نیاز اور ظہیر الدین احمد کو دعا کہہ دینا۔

ہاں بھائی مَیں از روے مصلحت اپنے کو مقامات مختلف کا عازم کہہ آیا ہوں اب جو شخص تم سے پوچھا کرے، اس سے پردہ نہ کرنا اور صاف کہہ دینا کہ رام پور کو گیا ہے، یعنی سب کو معلوم ہو جائے اور کوئی تذبذب میں نہ رہے۔

مرقومہ چاشتگاہ شنبہ ۲۱۔ جنوری سنہ ۱۸۶۰ء

(۱۲)

برخوردار سعادت و اقبال نشان حکیم غلام نجف خاں کو میری دعا پہنچے تمھاری تحریر پہنچی۔ تم جداگانہ خط کیوں نہ لکھا کرو؟ خط لکھا اور بیرنگ یا پوسٹ جس طرح چاہا، اپنے آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھیج دیا۔ مکان کا پتہ ضرور نہیں۔ ڈاک گھر میرے گھر کے پاس، ڈاک منشی میرا آشنا۔ اب تم ایک کام کرو۔ آج یا کل ڈیوڑھی جاؤ اور جتنے خط جمع ہیں وہ لو۔ مان سنگی مضبوط کاغذ یا لفافہ کرو اور بیرنگ لکھ کر کہاروں کے ہاتھ ڈاک گھر میں بھجوا دو اور اپنے خط میں جو حال شہر میں نیا ہو، وہ مفصل لکھو۔ جناب حکیم صاحب کو سلام نیاز اور ظہیر الدین احمد خاں کو دعا کہنا۔

اب میرا حال سنو: تعظیم و توقیر بہت، ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو دوا کو بھی میسّر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں، کچی دیواریں اور کھپریل، سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے ہیں وہ بھی ایسے ہیں۔ ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ مَیں خود ان سے ابتدا نہ کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے بالمشافہ نہ کہیں گے، مگر بواسطہ کارپردازانِ سرکار۔ دیکھوں کیا کہتے ہیں اور کیا مقرر کرتے ہیں؟ مَیں سمجھا تھا کہ میرے پہنچنے کے بعد جلد کوئی صورت قرار پائے گی، لیکن آج تک کہ جمعہ آٹھواں دن میرے پہنچنے

---

[1] غالب کے گھر
[2] بیگم غالب

کو ہے، کچھ کلام نہیں ہوا۔ کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس مُنہ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے "کوسی" سبحان اللہ ایسا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے، صاف، سُبک، گوارا، سریع النفوذ۔ اس آٹھ دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔ لڑکے بھی تندرست ہیں، آدمی بھی توانا مگر ہاں ایک عنایت[1] دو دن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر اچھا ہو جائے گا۔ والدعا۔

جمعہ ۳۔ فروری سنہ ۱۸۶۰ء

۱۳

میاں،

تم نے بُرا کیا کہ لفافہ کھول کر نہ پڑھ لیا۔ بارے آج سہ شنبہ ۱۴ فروری صبح کے وقت یہ لفافہ پہنچا اور اسی وقت پڑھوایا گیا۔ خط لفٹنٹ گورنر بہادر کا نہیں، یہ خط نواب گورنر جنرل بہادر کے چیف سکرتر کا ہے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے:

از دفتر خارجہ سکرتر اعظم حکم دیا جاتا ہے عرضی دینے والے کو، کہ جواب اس عرضی کا نواب گورنر جنرل بہادر بعد دریافت کے ارشاد فرمائیں گے۔ از کیمپ لودھیانہ

۲۸۔ جنوری سنہ ۱۸۶۰ء

یہاں کا یہ حال ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر آگرہ سے مراد آباد آیا چاہتے ہیں۔ مراد آباد یہاں سے بارہ کوس ہے۔ نواب صاحب دورے کو اپنے ملک کے گئے ہیں، دو چار دن میں پھر آئیں گے۔ اگر ان کی ملاقات کو مراد آباد جائیں گے، میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ اگرچہ گورنر غرب و شمال کو دلّی سے کچھ علاقہ نہیں، مگر دیکھوں کیا گفتگو درمیان

---

[1] میرزا کا ملازم۔ اس خط میں بھی رام پور کے حالات ہیں۔

آتی ہے۔ جو واقع ہو گا تمھیں لکھوں گا۔

یہ تم کیا لکھتے ہو کہ گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو۔ تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمھاری اُستانی کو لکھتا ہوں۔ کیا تم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ؟ اب ان کو خیال ہو گا کہ انگریزی خط میں کیا لکھا ہے۔ تم یہ خط میرا ہاتھ میں لے جاؤ اور حرف بحرف پڑھ سناؤ۔

لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں، کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر، بٹیریں، تکل، کنکوا سب سامان درست ہے۔ فروری مہینے کے دو دو روپے لے کر دس دن میں اُٹھا ڈالے۔ پھر پرسوں چھوٹے صاحب[1] آئے کہ دادا جان کچھ ہم کو قرض حسنہ دو دیا گیا آج ۱۴ ہے۔ مہینہ دُور ہے۔ دیکھئے کے بار قرض لیں گے۔ یہاں کا رنگ نواب صاحب کے آنے پر جو ہو گا اور جو قرار پائے گا وہ مفصل تم کو لکھوں گا اور تم اپنی والدہ[2] کو سُنا دینا۔ ہاں بھائی یہ بھی گھر میں پوچھ لینا کہ کدارناتھ نے اندر باہر کی تنخواہ بانٹ دی؟ میں نے تو وفادار اور حلال خوری تک کی بھی تنخواہ بھیج دی ہے۔

سہ شنبہ ۱۴- فروری ۱۸۶۰ء — غالب

(۱۴)

صاحب،

کل آخر روز تمھارا خط آیا۔ میں نے پڑھا، آنکھوں سے لگایا، پھر بھائی ضیاء الدین خاں صاحب کے پاس بھجوایا۔ یقین ہے کہ انھوں نے پڑھ لیا ہو گا؛ ما کُتِبَ فیہ معلوم کیا ہو گا۔ تمھارے یہاں نہ ہونے سے ہمارا دل گھبراتا ہے کبھی

---

[1] حسین علی خاں
[2] بیگم غالب

کبھی ناگاہ ظہیرالدین کا آنا یاد آتا ہے۔ کہو اب خیر سے کب آؤ گے؟ کے برس کے جینے کے دن راہ دکھاؤ گے؟ یہاں کا حال جیسا کہ دیکھ گئے ہو، بدستور ہے:

زمیں سخت ہے آسماں دُور ہے

جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ توانگر غرور سے، مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔ آبکاری کے بندوبست جدید نے مارا، عرق کے نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا۔ ادھر انسداد دروازہ آبکاری ہے، ادھر ولایتی عرق[1] کی قیمت بھاری ہے۔ انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون۔

مولوی فضل رسول صاحب حیدر آباد گئے ہیں۔ مولوی غلام امام شہید آگے سے وہاں ہیں۔ محی الدولہ محمد یار خاں سورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلایا ہے، پر یہ نہیں معلوم کہ وہاں ان کو کیا پیش آیا ہے۔ اگر تم معلوم ہو گیا ہو تو مجھ کو ضرور لکھو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

کیوں ظہیرالدین کیا میں اس لائق نہ تھا کہ تو ایک خط مجھ کو الگ لکھتا یا اپنے باپ کے خط میں اپنے ہاتھ سے اپنی بندگی لکھتا۔ حکیم غلام نجف خاں خط لکھنے بیٹھے، تیری بندگی لکھ دی، تیرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ اس بندگی کے آنے کی مجھے کیا خوشی؟

صبح یک شنبہ ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۳ء غالب

(۱۵)

بھائی،

میں تم کو کیا بتاؤں کہ میں کیسا ہوں؟ طاقت یک قلم جاتی رہی ہے۔ پھوڑا بدستور ہے۔ رستا ہے۔ خیر محل اندیشہ نہیں ہے، رس رس کر مادہ نکل جائے گا۔ اس سے

---

[1] یعنی شراب۔

اور زیادہ خستہ و افسردہ ہوں، قبض کہ وہ دشمن جانی ہے، ان دنوں میں حد کو پہنچ گیا ہے۔
بہ ہر حال:

مرگیست بنام زندگانی

حضرت غور کی جگہ ہے۔ ایک مکان دلکشا، کوچے کی سیر، بازار کا تماشا، دو کمرے دو کوٹھریاں، آتش دان، صحن وسیع، اس کو چھوڑ کر وہ مکان لوں جو ایک تنگ گلی کے اندر ہے؛ دروازہ وہ تاریک کہ دن کو بغیر چراغ کے راہ نہ ملے اور پھر ڈیوڑھی پر حلال خوروں کا مجمع، گوہ کے ڈھیر، کہیں حلال خوروں کا بچہ ہگ رہا ہے، کہیں بیل بندھا ہوا ہے، کہیں کوڑا پڑا ہوا ہے۔ عیاذاً باللہ! خدا نہ لے جائے ایسے مکان میں۔ تم نے وہ مسودہ کیوں نہیں بھیجا۔ میں خدمت گزاری کو آمادہ ہوں۔[۱۲]

نجات کا طالب غالب

(۱۶)

میاں،

تمہارا گلہ میرے سر و چشم پر، لیکن میرا حال سن لو اور اپنے وہم و قیاس پہ عمل نہ کرو۔ پہلے ظہیر دلپذیر کا خط آیا۔ پڑھتے ہی اس کا جواب لکھ رکھا۔ دوسرے دن ڈاک میں بھجوایا۔ مضمون بہ تغیّر الفاظ یہ: تم جو پھوڑے پھنسی میں مبتلا رہتے ہو اس کا سبب یہ کہ مجھ میں تمہارا لہو ملتا ہے اور میں احتراقِ خون کا پتلا ہوں۔ پھر تمہارا خط آیا، تیسرے دن اس کا جواب بھجوا دیا۔ مضمون یہ کہ تم سے تو میرا پیارا پوتا ظہیر الدین اچھا کہ جاتے وقت مجھ سے مل گیا اور وہاں پہنچتے ہی مجھ کو خط لکھا۔ رسید ڈاک گھر سے ملتی نہیں، خط دونوں پہنچے تھے۔ یہاں کے ڈاک گھر میں ممکن نہیں کہ میرے وہ دونوں خط رہ گئے ہوں۔ شیخوپور کی ڈاک کے ہرکاروں نے نہ پہنچایا۔ میرا کیا قصور؟ البتہ سرنامے پر صرف بستی کا نام اور تمہارا نام تھا؛ محلے کا نام نہ تھا۔

شاید اس سبب سے خط نہ پہنچا ہو۔ اسی وقت تمھارا خط آیا، مَیں نے لیٹے لیٹے یہ سطریں لکھیں۔ اب عنایت اللہ کو تمھارے گھر بھیجتا ہوں اور پچھوا منگواتا ہوں۔ کہ پتہ وہاں سے کیا لکھا جاتا ہے۔ لو صاحب، عنایت اللہ آیا اور یہ پرزہ لایا ہے۔ پتہ سرنامے پر لکھتا ہوں۔ مگر ڈاک کا وقت نہیں رہا۔ کل بھیج دوں گا۔ حکیم ظہیر الدین خاں کو دعا۔ بیٹا! اب اس وقت مجھ میں دم نہیں، دعا پر قناعت کر۔ تیرے خط کا جواب جیسا کہ اُوپر لکھ آیا ہوں، بھیج چکا ہوں۔ جھوٹے پر لعنت، تو بھی کہہ "بیش باد"۔

نواب مصطفےٰ خاں کل شہر میں آگئے۔ مع قبائل آئے ہیں۔ ذیقعدہ میں چھوٹے لڑکوں کی ختنہ اور ذی الحجہ میں محمد علی خاں کی شادی کریں گے۔ آج پانچواں دن ہے شہر میں مرغ کے انڈے برابر اولے پڑے، کہیں کہیں اس سے بڑے بھی۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر جدید آئے، دربار کیا، میری تعظیم اور مجھ پر عنایت میری تمنّا سے زیادہ کی۔ آؤ گے تو مفصل سُن لوگے۔

شنبہ ۴۔ ذی قعدہ (۱۲۸۱ھ، یکم اپریل ۱۸۶۵ء) نجات کا طالب غالبؔ

(۱۷)

میاں!

چاول بُرے، بڑھتے نہیں، لمبے نہیں، پتلے نہیں۔ اب زیادہ قصہ نہ کرو، پُرانے اور پتلے چاول آئیں۔ ایک روپے کے خرید کرکے بھیج دو۔ یاد رہے نئے چاول قابض ہوتے ہیں اور پُرانے چاول قابض نہیں ہوتے۔ یہ میرا تجربہ ہے۔

شام کو میر مجد الدین کہتے تھے کہ حکیم غلام نجف خاں کے پاس ایک کاتب ہے۔ بھائی دس بارہ جزو کی ایک کتاب نثر کی مجھ کو لکھوانی ہے۔ یہ معلوم کرلو کہ وہ

صاحب روپے کے کے جزو لکھیں گے اور روز کس قدر لکھ سکتے ہیں؟ یہ تواب لکھو اور پھر دوپہر کے بعد ان کو میرے پاس بھیج دو، تاکہ میں ان کو کاغذ اور منقول عنہ حوالے کروں۔ ظہیرالدین کو دعا کہو اور اس کا حال لکھو۔ غالبؔ

(۱۸)

برخوردار حکیم غلام نجف خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ بدھ کا دن، پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ میں فقط پالکی پر مراد آباد پہنچا۔ ۲۰۔ جمادی الاول ۱۲۸۲ھ کی اور ۱۱۔ اکتوبر ۱۸۶۵ء کی ہے۔ دونوں لڑکے، دونوں گاڑیاں اور رتھ اور آدمی سب پیچھے ہیں۔ اب آئے جاتے ہیں۔ رات بخیر گذرے، بشرط حیات کل رام پور پہنچ جائیں گے۔ گھبرایا ہوا ہوں، تیسرا دن ہے پائے خانہ پھرے کو۔ لڑکے بخیر و عافیت ہیں، اپنی اُستانی سے کہہ دینا۔ میرزا شہاب الدین خاں کو دعا، نواب ضیاءالدین کو سلام۔ میرا رقعہ ان دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا، ضرور ضرور۔ ظہیرالدین دعا سے خفا ہوگا، اس کو میری بندگی کہنا۔[1] غالبؔ

(۱۹)

اقبال نشان عضدالدولہ حکیم غلام نجف خاں کو غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔

تمھارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم میں یہاں خوش اور تندرست ہوں۔ دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، متنجن، پسندے، دونوں وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربے، اچار، میں بھی خوش، لڑکے بھی خوش۔ کلوا اچھا ہو گیا۔ سقا، مشعلچی، خاکروب، سرکار سے متعین ہے۔ حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔ آج تک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ تعظیم، تواضع، اخلاق، کسی باب میں کمی نہیں۔

---

[1] یہ اور اس سے اگلے تین خط دوسرے سفر رام پور سے متعلق ہیں۔

ظہیر الدین خاں بہادر کو دعا پہنچے۔ یہ خط لے کر تم اپنی دادی صاحب کے پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور ان سے یہ کہہ دو کہ وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی، وہ غلط ہے، اس کی کچھ اصل نہیں ہے، باقی خیر و عافیت۔

صبح شنبہ ۲۱ ماہ اکتوبر ۱۸۶۵ء غالب

(۲۰)

صاحب،

تم سچ کہتے ہو۔ بھائی فضل اللہ[1] خاں کی غمخواری اور مددگاری کا کیا کہنا ہے۔ مگر الور سے مجھ کو لینا نہیں۔ یاد رکھنا کہ وہاں سے مجھے کچھ نہ آئے گا۔ بالفرضِ محال اگر ملا تو ڈھائی سو روپیہ، سو وہ بھی مجھے بھائی فضل اللہ خاں کا دینا ہے۔ ان کا قرض ادا ہو جائے گا۔ احیاناً اگر خلاف میرے عقیدے کے پانسو روپیہ کا حکم ہوا اور وہ آجائیں تو بعد اطلاع ڈھائی سو میاں فضل کو دے کر مجھے لکھنا۔ باقی کے واسطے میں جس طرح لکھوں، اس طرح کرنا۔

لو صاحب نسخ چلّی بنا خیالی پلاؤ پکا لیا۔ اب روداد سنو۔ نواب صاحب[2] کا اخلاص و التفات روز افزوں ہے۔ آج منگل کا دن ۴۔ جمادی الثانی کی اور ۲۴۔ اکتوبر کی ہے۔ کھانے کی اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھانس دانے کی نقدی ہو گئی لیکن اس میں میرا فائدہ ہے، نقصان نہیں۔ دسمبر کی پہلی سے جشن شروع ہوگا ہفتہ دو ہفتہ کی مدت اس کی ہے۔ بعد جشن کے رخصت ہوں گا۔ خدا چاہے تو آخر دسمبر تک تم کو آ دیکھتا ہوں۔ ظہیر الدین خاں کو دعا۔

(۲۴۔ اکتوبر ۱۸۶۵ء)

---

[1] یہ امین اللہ خاں دیوان الور کے بھائی تھے۔ راجا شیو دھیان سنگھ کو اختیارات ملے تھے تو یہ دربار الور میں پہنچ گئے تھے۔

[2] نواب کلب علی خاں والی رام پور جن کے جشن جلوس میں شریک ہونے کے لیے میرزا غالب دوسری مرتبہ رام پور گئے تھے۔

(۲۱)

صاحب،

تمھارے دو خط متواتر آئے۔ ظہیر الدین کا آگرے جانا، میرا خط اس کا موسومہ تمھارے پاس پہنچنا اور اس کا آگرے کو روانہ ہونا۔ ظہیر الدین کی دادی کا بعارضۂ مرض ۔۔سال رنجور ہونا۔ کدارناتھ کا مجھ سے خفا ہونا، مکان کے روکنے کی اجازت کا مانگنا۔ فضل حسن سے میرے واسطے دریوزۂ تفقد کرنا۔ یہ مدارج و مطالب معلوم ہوئے۔ ظہیر الدین کا خط تم نے کیوں کھولا؟ وہ مغلوب الغضب ہے، تم پر خفا ہوگا۔ اس کی دادی اس موسم میں ہمیشہ ان امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایک نسخہ ان کے پاس ماء اللحم کا ہے، وہ کھنچوا دو اور ذرا خبر لیتے رہو۔ کدارناتھ لڑکا ہے، وہ مجھ سے کیا خفا ہوگا؟ روپیہ جو خزانہ میں جمع ہوگا، آخر وہیں پائے گا۔ خفا نہیں ہوں کہ روپیہ دام دام پایا اور میرا تمسک نہ دیا اور چھٹا تئیس روپے آٹھ آنے کا نہ بانٹا۔ مکان کے روکنے کو اور کس طرح لکھوں؟ شہاب الدین خاں کو لکھا، شمشاد علی بیگ کو لکھا، اب تم کو لکھتا ہوں۔ ستمبر کے پانچ روپے آٹھ آنے دیتا ہوں۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر یہ سولہ روپے آٹھ آنے اگر دوں گا، بلکہ اگر موقع بنے گا تو یہ سہ ماہہ یہاں سے بطریق ہنڈوی بھیج دوں گا۔

اسماعیل خاں صاحب کو میری دعا کہو اور یہ کہ ڈیوڑھی کی سیڑھی بنوا دیں اور جو بیں کے پاخانے کی صورت درست کروا دیں۔ ہائے قسمت، اس قسمت پر لعنت کہ میاں فضل حسن میرے مربی و محسن بنیں اور پھر وائے محرومی کہ مطلب برآری نہ ہو۔ لونڈوں کا احسان زہرِ قاتل ہے۔ فضل اللہ خاں میرا بھائی ہے، اس کا احسان مجھ کو گوارا۔ سو بار اس سے کہا اور ہزار بار کہوں گا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب آپ اس سے زنہار نہ کہیے گا، نہ لکھیے گا۔ اگر کچھ کہو، تو فضل سے کہو واللہ۔

۱؎ بیگم غالب

نواب صاحب دورے سے یا آج شام کو یا کل آجائیں گے جشن جمشیدی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

یکشنبہ ۱۲ نومبر ۱۸۶۵ء صبح وقت　　　　نجات کا طالب غالب

(۲۲)

حکیم غلام نجف خاں[1]

اگر تم نے مجھے بنایا ہے، یعنی اُستاد اور باپ کہتے ہو، یہ امر از روئے تمسخر ہے تو خیر، اور اگر از روئے اعتقاد ہے، تو میری عرض مانو اور ہیرا سنگھ کی تقصیر معاف کرو۔ بھائی انصاف کرو۔ اس نے اگر حکیم حسن اللہ خاں سے رجوع کی، وہ تمھارے بھائی بھی ہیں اور تم کو ان سے استفادہ بھی ہے۔ اگر گھبرا کر حکیم محمود خاں کے پاس گیا، تو ان کے باپ سے تم کو نسبت تلمذ کی ہے۔ ابتدا میں ان سے پڑھے ہو۔ پس یہ غریب سوائے تمھارے اگر گیا تو تمھارے ہی علاقہ میں گیا، وہ بھی گھبرا کر اور خفقان سے تنگ آکر۔ اب جو حاضر ہوتا ہے تو لازم ہے کہ اس پر بہ نسبت سابق کے زیادہ توجہ فرماؤ اور بہ دل اس کا معالجہ کرو۔

التفات کا طالب غالب

حکیم ظہیر الدین احمد خاں

(۱)

اقبال نشان حکیم ظہیر الدین احمد خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ کہو میاں! تمھارا مزاج کیسا ہے اور تمھارے بھائی مرزا تفضل حسین خاں کیسے ہیں؟ اگر ملو تو میری دُعا کہنا اور مزاج کی خیر پوچھنا اور اپنے والد ماجد کو میری دُعا

---

[1] حکیم غلام نجف خاں

کہنا اور کہنا کہ تمھارا خط میرے خط کے جواب میں تھا، اس صورت میں اور کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔

سنو میاں ظہیر الدین تم اپنی دادی کے پاس ابھی چلے جاؤ اور ان سے میری اور دونوں لڑکوں کی خیر و عافیت کہو اور پوچھو کہ شہاب الدین خاں نے اکتوبر کے مہینے کی تنخواہ کے پچاس روپئے پہنچا دیئے یا نہیں؟ کدارناتھ ڈیوڑھی پر آگر جعفر بیگ، وفادار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا یا نہیں؟ اچھا میرا بیٹا یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو لکھیو، دیر نہ کیجیو۔

پنجشنبہ ۲۔ ۱۸۶۵ء — خط کے جواب کا طالب غالب

(۲)

جناب فیض مآب چچا صاحب قبلہ و کعبۂ دو جہاں کے حضور میں کورنش و تسلیم پہنچاتا ہوں اور ہزار زبان سے اس توپ کے مرحمت فرمانے کا شکر بجالاتا ہوں۔ سبحان اللہ کیا توپ، جس کی آواز سے رعد کا دم بند اور رنجک کے رشک سے بجلی کو رنج۔ گولہ اس کا خدا کا قہر، دھواں اس کا دریائے عشق کی لہر۔ استغفر اللہ کیا باتیں کرتا ہوں، جھوٹ سے دفتر بھرتا ہوں، کیسی رنجک، کیسا دھواں، کیسا گراب، یہ وہ توپ ہے کہ بغیر ان عوارض کے صرف اس کی آواز سے رستم کا زہرہ آب ہو جائے۔ اب بارود ہو تو رنجک اُڑے، آگ دہکائیں تو دھواں ہو، گولہ چھرا کچھ اس میں بھریں تو ظاہر میں کہیں نشان ہو، صرف اس کی آواز پر مدار ہے، نئی ترکیب اور نیا کاروبار ہے۔ ایک آواز اور اس میں یہ اعجاز کہ دوست کو فتح کی شلک کی صدا سُنائے، دشمن سُنے تو ہیبت سے اُس کا کلیجہ پھٹ جائے۔ آواز کا صدمہ اگرچہ صدائے صور سے دونا ہے، مگر ہمیں یہی کہتے بن آتا ہے کہ صور کا نمونہ ہے۔ کیا خدا کی قدرت ہے ادیکھو تو کیسی نُدرت

عا۔ یہ اس رقم کی طرف اشارہ ہے جو بیگم غالب کو لوہارو سے ملتی تھی

ہے۔ توپ کا گولہ توپ ہی میں رہ جائے اور جو قلعہ روبرو آئے، وہ ڈٹ جائے۔ دانا آدمی ایسے زنجیری گولہ کہتا ہے کہ توپ میں سے نکل کر پھر وہیں اُلجھ رہتا ہے۔ اچھے میرے چچا جان، یہ توپ کس نے بنائی اور تمھارے ہاتھ کہاں سے آئی؟ جو دیکھتا ہے، وہ حیران ہوتا ہے، اب شہر میں جابجا اسی کا بیان ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ تم کو ہمارے سر پر سلامت رکھے اور ہمیشہ بدولت و اقبال و عز و کرامت رکھے۔

نواب حسین میرزا اور متعلقین

میر محمد امین موسوی حضرت امام موسےٰ کاظم رہ کی اولاد میں سے تھا۔ ہندوستان آکر اس نے بڑا عروج حاصل کیا۔ سعادت خاں برہان الملک خطاب ملا اور اودھ کے حاکم مقرر ہوا۔ اس کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ صرف لڑکیاں تھیں۔ جن میں سے ایک کو اس نے اپنے بھانجے میرزا مقیم سے بیاہ دیا تھا اسے بعد میں صفدر جنگ خطاب ملا۔ شجاع الدولہ، آصف الدولہ، سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر وغیرہ اس کے اخلاف اور جانشین تھے۔

میر محمد امین کا ایک ہم جد بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ وہ بھی لکھنؤ میں مقیم تھا۔ اس شاخ میں سے ایک کا نام غیاث الدین محمد تھا۔ جس کا فرزند اکبر حسام الدین حیدر تھا۔ حسام الدین حیدر کی والدہ فوت ہوگئی تو غیاث الدین محمد نے ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں وزیر شاہ عالم ثانی کی بیٹی سے شادی کر لی۔ نواب سید محمد خاں اس کے بطن سے تھے۔

---

[1] یہ خط غالب نے ظہیر الدین کی طرف سے لکھا تھا۔

حسام الدین حیدر کو علاتی والدہ کا طریق سلوک پسند نہ آیا اور وہ لکھنؤ سے نکل کر دہلی چلے آئے۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ انھوں نے سات گاؤں کی جاگیر کے علاوہ دربار میں عہدہ دے دیا۔ لکھنؤ سے بھی خاصی رقم ماہوار مل جاتی تھی۔ نقد روپیہ بھی کافی ساتھ لائے تھے۔ دہلی میں جائداد خرید لی۔ شاہان اودھ کی دہلی والی جائداد کا انتظام انھیں کے حوالے ہوگیا۔ مبارز الدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ خطاب ملا۔ بلی ماراں میں ان کی حویلی تھی۔ شاعر بھی تھے اُردو میں نامی تخلص کرتے تھے۔ دیوان ریختہ مرتب کرلیا تھا جس کا دیباچہ مرزا غالب نے لکھا تھا اور وہ ان کی کتاب پنج آہنگ کے آہنگ چہارم میں موجود ہے۔ سُنا ہے کہ اب یہ دیوان ریختہ مہاراجہ محمود آباد کے کتب خانہ میں ہے۔ فارسی دیوان بھی تھا لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں مل سکا۔ ۱۸۴۷ء میں فوت ہوئے۔

حسام الدین حیدر خاں کی شادی نواب نجف علی خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان کے دو فرزند اور ایک دختر تھی۔ فرزندوں میں سے بڑے مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں، دوسرے معین الدولہ ذوالفقار الدین حیدر خاں ذوالفقار جنگ جن کا نام حسین مرزا تھا۔ دختر کا نام قدسیہ سلطان تھا۔ ان کی شادی مرشد آباد کے ایک عالی خاندان امیر محمد نصیر سے ہوئی تھی۔ وہ زیادہ تر لکھنؤ میں رہتے تھے۔ لیکن قدسیہ سلطان نے زندگی کا بڑا حصّہ دہلی میں گزارا۔ ان کے فرزند یوسف مرزا تھے۔ جن کے نام غالب کے خطوط ہیں۔ وہ ۸۳-۱۲۸۲ھ میں لکھنؤ میں فوت ہوئے۔

مظفر الدولہ نے کبھی کوئی مشغولیت قبول نہ کی اور اپنی خاندانی جائداد پر امیرانہ گزر اوقات جاری رکھی۔ ان کی شادی شمس الدولہ بخشی الممالک بخشی محمود خاں

کی صاحبزادی عالیہ بیگم سے ہوئی تھی۔

حسین مرزا ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے بھائی سے چودہ برس اور بہن سے چار برس چھوٹے تھے۔ ان کی شادی ضمیر الدولہ جلیل الملک۔ افتخار الامرا احمد حسین نظارت خاں بہادر مستقیم جنگ کی صاحبزادی حسینی بیگم سے ہوئی اور خسر کے انتقال کے بعد شاہی نظارت کا عہدہ حسین میرزا ہی کو ملا۔ جس پر وہ غدر تک فائز رہے۔

جب غدر ہوا تو مظفر الدولہ کو بھائی کے متعلق سخت تشویش پیدا ہوئی۔ ہندوستانی سپاہ تمام امور پر قابض ہو چکی تھی۔ حسین مرزا چاہتے بھی تو ملازمت چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتے تھے۔ بلکہ خود بہادر شاہ بھی مجبور اور بے بس تھے۔ جب انگریزی سپاہ دہلی میں داخل ہوئی تو مظفر الدولہ دوسرے لوگوں کے ساتھ الور چلے گئے، جہاں کا راجا ان کا دوست تھا۔ الور سے وہ پکڑے آئے اور گوڑگانوں میں انگریز افسروں نے مقدمے یا تحقیق و تفتیش کے بغیر انھیں دوسرے لوگوں کے ساتھ گولی مار کر شہید کر ڈالا۔

حسین میرزا متعلقین سمیت پہلے صفدر جنگ کے مقبرے میں چلے گئے اور کس حالت میں؟ اجمیری دروازے سے لے کر مقبرے تک چار پانچ میل کا فاصلہ ہوگا۔ یہ فاصلہ طے کرنے میں دس ہزار روپے کی رقم لٹیرے گوجروں کے حوالے کرنی پڑی۔ پھر نواب حامد علی خاں بندوبست کر کے حسین مرزا کو متعلقین سمیت چپ چاپ نکال کر اپنے گاؤں برست لے گئے، جو پانی پت کے قریب ہے۔ وہ دربار کے ناظر رہ چکے تھے۔ جگہ جگہ ان کی تلاش ہو رہی تھی۔ جب انگریزوں کو معلوم ہوگیا کہ وہ برست میں ہیں۔ تو گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے، لیکن اس سے پیشتر حسین مرزا پانی پت پہنچ گئے۔ انصاریوں

کی صاحبزادی عالیہ بیگم سے ہوئی تھی۔

حسین مرزا ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے بھائی سے چودہ برس اور بہن سے چار برس چھوٹے تھے۔ ان کی شادی ضمیر الدولہ جلیل الملک۔ افتخار الامرا احمد حسین نظارت خاں بہادر مستقیم جنگ کی صاحبزادی حسینی بیگم سے ہوئی اور خسر کے انتقال کے بعد شاہی نظارت کا عہدہ حسین میرزا ہی کو ملا۔ جس پر وہ غدر تک فائز رہے۔

جب غدر ہوا تو مظفر الدولہ کو بھائی کے متعلق سخت تشویش پیدا ہوئی۔ ہندوستانی سپاہ تمام امور پر قابض ہو چکی تھی۔ حسین مرزا چاہتے بھی تو ملازمت چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتے تھے۔ بلکہ خود بہادر شاہ بھی مجبور اور بے بس تھے۔ جب انگریزی سپاہ دہلی میں داخل ہوئی تو مظفر الدولہ دوسرے لوگوں کے ساتھ الور چلے گئے، جہاں کا راجا ان کا دوست تھا۔ الور سے وہ پکڑے آئے اور گوڑگانوں میں انگریز افسروں نے مقدمے یا تحقیق و تفتیش کے بغیر انھیں دوسرے لوگوں کے ساتھ گولی مار کر شہید کر ڈالا۔

حسین میرزا متعلقین سمیت پہلے صفدر جنگ کے مقبرے میں چلے گئے اور کس حالت میں؟ اجمیری دروازے سے لے کر مقبرے تک چار پانچ میل کا فاصلہ ہوگا۔ یہ فاصلہ طے کرنے میں دس ہزار روپے کی رقم لٹیرے گوجروں کے حوالے کرنی پڑی۔ پھر نواب حامد علی خاں بندوبست کر کے حسین مرزا کو متعلقین سمیت چپ چاپ نکال کر اپنے گاؤں برست لے گئے، جو پانی پت کے قریب ہے۔ وہ دربار کے ناظر رہ چکے تھے۔ جگہ جگہ ان کی تلاش ہو رہی تھی۔ جب انگریزوں کو معلوم ہوگیا کہ وہ برست میں ہیں۔ تو گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے، لیکن اس سے پیشتر حسین مرزا پانی پت پہنچ گئے۔ انصاریوں

نے اپنی جانوں پر کھیل کر انھیں بچایا۔ پھر وہ بھیس بدل کر لکھنؤ پہنچے اور وہاں روپوش رہے۔ جب اعلانِ عفوِ عام ہوا تو دہلی واپس آئے۔ لیکن جائداد ضبط ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں ان کے لکھنوی عزیزوں کے علاوہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر نے کمال اہتمام سے حق دوستی ادا کیا اور جتنی مدد وہ دے سکتے تھے دیتے رہے۔ سُنا ہے کہ حسین میرزا کچھ مدت کے لیے بیکانیر میں تحصیلدار بن گئے تھے

سر سالار جنگ وزیر اعظم حیدر آباد دہلی آئے تو حسین میرزا ان سے بھی ملے۔ سالار جنگ نے پہلے نہ ملنے پر بڑے افسوس کا اظہار کیا اور بہ تاکید کہا کہ حیدر آباد آ جائیں۔ وہاں جانا چاہتے تھے کہ اس اثنا میں جنون کے آثار نمودار ہوئے۔ جن ہولناک مصائب سے وہ گزر چکے تھے، ان کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا۔ باقی ساری زندگی بہ حالتِ جنون گزری۔ ۶۔ رمضان ۱۳۰۷ھ (۲۶ اپریل ۱۸۹۰ء) کو فوت ہوئے۔ میر مہدی مجروح نے تاریخ وفات لکھی:

حسین میرزا چوں مرد در شش رمضاں ازاں کہ بود ز نسل امیر خیبر گیر
پئے شمارۂ سال وفات رضواں گفت بیا بہ کاخِ جناں اے امیر ابن امیر
۱۳۰۷

ان کے بڑے فرزند سجاد میرزا تھے۔ چھوٹے فرزند اکبر میرزا۔ دونوں کی اولاد موجود ہے۔ اکبر میرزا نے خاندان کے پورے حالات لکھ دیے تھے۔ اس قیمتی کتاب کا مسودہ ان کے فرزند احسن میرزا کے پاس ہے انھیں سے مجھے خاندانی حالات تفصیلاً معلوم ہوئے اور اکبر میرزا کی لکھی ہوئی کتاب بھی سرسری طور پر میں نے دیکھی۔

میرزا غالب کے ساتھ پورے خاندان کے گہرے تعلقات تھے خصوصاً حسین میرزا کے ساتھ تو حقیقی بھائیوں کی سی محبت تھی۔ سجاد میرزا، اکبر میرزا اور یوسف میرزا کو غالب اپنے عزیز ترین اقربا میں سمجھتے تھے۔ دو آدمی تھے جن

کے پاس میرزا کا پورا کلام جمع ہوتا تھا۔ ایک ضیاء الدین احمد خاں نیر دوسرے ذوالفقار الدین حیدر حسین میرزا جنھیں بعض اوقات عہدے کی بناء پر میرزا غالب "ناظر جی" لکھتے ہیں۔ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کے صاحبزادے آغا ابراہیم کی شادی اسی خاندان میں ہوئی تھی۔

(۱)

جناب نواب صاحب،

شکوہ کرنا سہل ہے۔ سبز سیاہی کہیں سے مفت کی ہاتھ آگئی، حضرت نے شکوہ لکھا۔ یوسف مرزا صاحب نے نظم و نثر کے لکھنے کا حکم چڑھایا۔ بھائی تمھارے خط کا جواب آگے لکھ کر بھیج چکا ہوں۔ اپنی طرف سے سلطان[۱] عالم کو ابھی عرضی نہ لکھوں گا۔ اور جب لکھوں گا تو خدا میرے خداوند[۲] کو سلامت رکھے، بواسطہ ان کے بھیجوں گا۔ تم کو چاہیئے کہ اپنی طرف سے فارسی متعارفہ مروجہ میں لکھ بھیجو۔ یہی تم کو لکھ چکا ہوں اور اب یہی جواب ہے یوسف میرزا کو۔

پرسوں مرزا آغا جان صاحب آئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بھاڑا سنگھ اور کاشی ناتھ آئے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ نہ میرے کام کے، نہ تمھارے کام کے۔ کام کریں کیا، گنجایش ہی نہیں۔ اور جو کچھ ہوتا جاتا ہے وہ اس قسم کا ہے کہ جس طرح صبح ہوئی، شام ہوئی، ابر آیا، مینہ برسا یعنی سعی کو، تدبیر کو، خواہش کو دخل نہیں۔ آبادی[۳] کا آوازہ پھر فرو ہے۔ لاہوری دروازے کے علاقے میں کچھ کم سو گھر آباد ہوے ہیں۔ کئی ہزار گھر کی بستی ہے۔ انشاء اللہ تعالےٰ دو چار برس

۱۔ واجد علی شاہ پادشاہ اودھ جو ۱۸۵۶ء سے معزول ہو کر کلکتہ میں مقیم تھے۔
۲۔ مجتہد العصر۔
۳۔ یعنی دہلی شہر میں ان لوگوں کی آبادی جو غدر میں گھر بار چھوڑ کر باہر نکل گئے تھے۔

میں وہ علاقہ آباد ہو جائے گا۔ اور جب وہ علاقہ آباد ہو جائے گا تو دوسرا علاقہ شروع ہوگا۔ گھبراؤ نہیں، جلدی کیا ہے۔ آج سردار سنگھ والد جگت سنگھ میرے پاس آئے تھے، تمھارے مکان کا پتہ لکھوا لے گئے ہیں۔ شاید تم کو خط لکھیں۔ میر عنایت حسین گڑھ پنکھ بن کر اڑ گئے۔ کئی آدمیوں سے کہا۔ انھوں نے کہا اب وہ وہاں نظر نہیں آتے۔ میرے پاس ہر ہفتے کے آنے والے، اب مہینے بھر سے نہیں آئے۔ میر مرتضیٰ حسین کا خط ان کے نام کا میرے پاس دھرا ہے۔ جب وہ آئیں گے ان کو دے دوں گا۔ جگت سنگھ کا لکھنؤ سے روانہ ہونے کا قصد سردار سنگھ سے کہہ دیا۔ اب کے تمھارے خط میں مظفر میرزا کی طرف سے کچھ نہیں۔ اس سے مستنبط ہوا کہ وہ اور جگت سنگھ، جیسا کہ تم نے لکھا تھا، لکھنؤ سے کول و مراد آباد کو گئے۔ میر امداد کا ذکر میں نے مرزا آغا جان صاحب سے کر دیا ہے کہ اچھا ہے اگر وہ حسین میرزا صاحب اور حسینی صاحب کی طرف سے مختار کار ہو جائیں۔ کل جمعہ تھا۔ یقین ہے کہ صاحب کمشنر سے ملے ہوں گے، عرضی دی ہوگی۔ اس کا حال مجھ کو لکھو۔

یہ ہو لیا، اب میرا دکھ سنو۔ بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا۔ دفتر قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا۔ کسی طرح کی بے خیالی و نمک حرامی کا دھبا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلاں تاریخ اسد اللہ خاں غالب نے یہ سکہ کہہ کر گزارنا:

بہ زر زد سکۂ کشور ستانی سراج الدیں بہادر شاہ ثانی

مجھ سے عندالملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے۔ میں نے کہا کہ غلط لکھتا ہے۔ پادشاہ شاعر، پادشاہ کے بیٹے شاعر، پادشاہ کے نوکر شاعر،

خدا جانے کس نے کہا۔ اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہ گزرانا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گزرتا۔ اور آپ کو چاہئے حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھئے۔ اس وقت تو چکا ہو رہا۔ اب جو اس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی روبکاری لکھی کہ یہ جو اسد اللہ خاں فارسی کے علم میں یکتا مشہور ہے، اس سے کام نہیں نکلتا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکّہ لکھا۔ ہمارے نزدیک پنسن کے پانے کا مستحق نہیں ہے۔ غرض اس مقصود سے یہ ہے کہ میں یہاں موجود ہوں اور ملنے سے راہ و رسم ہے۔ یہ تو کوئی بتاتا نہیں کہ تاریخ روبکاری کیا ہے اور یہ صدر کو بھیجی گئی ہے یا نہیں؟ اب حیران ہوں کہ کیا کروں۔ کمشنر جدید سے ملوں گا۔ اسی سے، اگر دے گا تو نقل لوں گا۔ جواب ازراہ احتیاط اس کمشنر کے عہد میں بھی بھیج چکا ہوں۔ مگر غور..... اور ایک جانب سے مقدمہ کیا۔ بھائی میں تو علی علی کر رہا ہوں، جیوں تو اور مروں تو۔ کہیں جواب صاف مل چکے تو اس شہر سے چلا جاؤں۔ یہ دو روپے[ع] روز بھی اس غاصب ملعون کی گور میں جائیں جس نے مجھے دس ہزار روپے سال میں سے یہ کچھ دیا ہے۔ علیہ اللعنت والعذاب۔

یوسف میرزا کو دعا پہنچے۔ بھائی یہاں میر احمد حسین والد میر روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت! جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو میں مرشد آباد میں تھا۔ وہاں میں نے یہ سکہ سُنا تھا ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ جہاں چھاپی تھی وہاں اس سکے کا گزرنا ذوق کی طرف سے چھاپا تھا۔ اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے[ع] ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء میں

ع میرزا کو باسٹھ روپے آٹھ آنے پنشن ملتی تھی۔ اسے دو روپے روز سے تعبیر کیا۔
ع صحیح تاریخ جلوس اکتوبر ۱۸۳۷ء ہے۔

ہوا ہے۔ بعض صاحب اخبار جمع رکھتے ہیں۔ اگر وہاں اس کا پتہ پاؤ گے اور وہ پرچہ اخبار اصل بجنسہٖ مجھ کو بھجواؤ گے تو بڑا کام کرو گے۔ میں نے اکبرآباد، فرخ آباد، مارہرہ، میرٹھ اپنے احباب کو لکھا ہے۔ اب تم کو بھی لکھا ہے۔ کالپی کو لکھنا باقی ہے۔ وہ بھی کل پرسوں لکھوں گا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۸۳۳ء، ۱۸۳۴ء تین مہینوں کے بارہ پارچۂ اخبار دیکھے جائیں۔

محررہ شنبہ ۱۸۔ جون ۱۸۵۹ء

(۲)

یا حسین ابن حیدر، روحی فداک

یہاں تک لکھ چکا ہوں کہ محمد قلی خاں کے نام کا خط کلو سے بنو بیگم صاحبہ نے لے لیا۔ محمد قلی خاں علی گنج[1] گئے ہوئے تھے۔ کل رضا شاہ کی زبانی معلوم ہوا کہ صاحب نے وہ خط میر رستم علی کو دیا اور وہ اس خط کو لے کر درگاہ گئے۔ آفرین صد آفرین میر رستم علی کو، دوست کے کام کے واسطے اتنی دور پیادہ جانا۔ آج دوپہر کو میر صاحب میرے پاس آئے اور وہی خط کھلا ہوا لائے اور کہا کہ میں نوندرائے کو حرف بہ حرف یہ خط پڑھا لایا ہوں۔ میں نے کہا کہ کاشی ناتھ کو کیوں نہ دکھایا؟ انھوں نے کہا کہ تم دیکھ کر پڑھ کر اپنے آدمی کے ہاتھ کاشی کے پاس بھیج دینا۔ میں نے سوچا کہ کاشی ناتھ دیکھے گا اور اُلٹا پھیر دے گا۔ نہ آدمی سے کچھ کہے گا، نہ میرے پاس آئے گا۔ میں نے میر صاحب سے کہا آپ ہی کاشی ناتھ کو دکھا کر اور اس سے بات چیت کر کے مجھ کو لا دیجیے گا۔ وہ اس خط کو بہ موجب میرے کہنے کے لے گئے۔ کل پرسوں وہ آئیں گے، تب فکر کی جائے گی۔ مگر بھائی پیچ یہ پڑا ہے کہ محمد قلی خاں

---

[1] درگاہ شاہ مرداں دہلی

رضا شاہ کے ساتھ پاٹودی جاتے ہیں۔ محرم وہاں کریں گے۔ لاڈو بیگم والدۂ اکبر علی خاں نے ان کو بُلایا ہے، تو اب یہ مقدمہ ان کی معاودت کے بعد ہوگا۔ کاغذ میرے پاس دھرے رہیں گے۔

صاحب! محمد قلی خاں نے غلط لکھا ہے، نہ حسن علی خاں مقید، نہ حامد علی خاں، نہ حکیم احسن اللہ خاں۔ حکم آخر ان تینوں صاحبوں کے واسطے نہیں ہُوا۔ حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات پر ان کو قبضہ مل گیا۔ زنانے مکان میں، جو عقب حمام ہے، ایک انگریز اترا ہوا ہے۔ پینتیس روپے مہینا ان کو کرایہ دیتا ہے۔ اور وہ دونوں آدمی ابھی یونہی اُلجھے ہوئے ہیں۔ احسن اللہ خاں اپنے مکان میں جا رہے۔ دیوان خانے کو محل سرا بنایا۔ خود جہاں اصطبل تھا وہاں بیٹھتے ہیں۔ دیبی رام سالگ رام کو ان کے مکانات مل گئے۔ ایسا بھی سُنا ہے کہ ان کے دفینے بچ گئے۔ اب وہ حامد علی خاں کو قطب الدین سوداگر کی حویلی سے اُٹھا کر اپنے مکان میں لے گئے ہیں۔ سردار مرزا کا حال مجھے اس سے زیادہ نہیں معلوم کہ رضا شاہ کبھی کبھی ان کی بندگی مجھ کو کہہ دیتے ہیں۔ آج یا کل رضا شاہ آ گئے تو میں بیگانہ وار نکاح و متعہ کا حال ان سے پوچھ لوں گا۔

پنجشنبہ ۲۶۔ ذی الحجہ (۱۲۷۶ھ) ۲۸۔ جولائی (۱۸۵۹ء)

(۴۳)

بھائی،

تمھارے خطوں کا اور یوسف مرزا کے خطوں کا جواب بھیج چکا ہوں۔ محمد قلی خاں صاحب ہمہ تن مصروف ہیں۔ دوالی کی تعطیل ہو چکی ہے۔ نوند رائے کی بی بی مر گئی ہے، وہ غم زدہ ہو رہا ہے، مگر خیر کام کرے گا۔ کاشی ناتھ بے پروا آدمی ہے۔ تم ایک خط تاکید کی اس کو بھی لکھ بھیجو۔ اکثر وہ کہا کرتا ہے کہ حسین مرزا صاحب جب لکھتے ہیں، مرزا نوشہ

۱۔ حسن علی خاں اور حامد علی خاں

صاحب ہی کو لکھتے ہیں۔ یہ امر اس پر ظاہر نہ ہو کہ مَیں نے تمھیں یوں لکھا ہے مطلب اپنا اس کو لکھو۔

مَیں کیا کروں؟ اگر کہوں کہ میری جان بھی تمھارے کام آئے تو مَیں حاضر ہوں' یہ کہنا تکلّف محض ہے۔ کون جان دیتا ہے اور کون کسی سے جان مانگتا ہے؟ مگر جو فکر مجھ کو تمھاری ہے اور جو میری دسترس ہے اس کو میرا خدا اور میرا خداوند جانتا ہے۔ دسترس کو تم بھی جانتے ہو۔ انشاءاللہ تعالیٰ اوائل ماہ آیندہ یعنی نومبر میں نیرؔ[1] والا مقدمہ درست ہو جائے۔

ان سطور کی تحریر سے مراد یہ ہے کہ ابھی چنی لال تمھارا قرضخواہ آیا تھا۔ تمھارا حال پوچھتا تھا۔ کچھ جھوٹ سچ کہہ کر اس کو اس راہ پر لایا ہوں کہ سو دوسو روپے تم کو بھیج دے۔ بنیوں کی طرح تقریر اس کو سمجھائی ہے کہ لالہ جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے تو اس کو پانی دیتے ہیں۔ حسین میرزا تمھارے کھیت ہیں۔ پانی دو تو کچھ اناج پیدا ہو۔ بھائی کچھ تو نرم ہوا ہے۔ تمھارے مکان کا پتہ لکھوا کر لے گیا ہے اور کہہ گیا ہے کہ میں اپنے بیٹے رامجی داس سے صلاح کر کے جو بات ٹھہرے گی، آپ سے آکر کہوں گا۔ اگر وہ روپیہ بھیج دے تو تو کیا کہنا ہے اور اگر وہ خط لکھے اور تم اس کا جواب لکھو، تو یہ ضرور لکھنا کہ اسد اللہ نے جو تم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور وہ امر ظہور میں آنے والا ہے۔ بس زیادہ کیا لکھوں۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ سردار مرزا[2] صاحب تشریف لائے۔ مَیں نے خط ان کو

---

[1] ضیاءالدین احمد خاں نیرؔ۔ مقدمے سے مراد غالباً وہ مقدمہ ہے جو نیرؔ نے اپنے بڑے بھائی نواب لوہارو کے خلاف دائر کیا تھا۔

[2] ان سے مراد غالباً سردار میرزا ابن نواب حیدر حسن خاں ہیں جو اعتماد الدولہ میر فضل علی نائب السلطنت اودھ کے نواسے یعنی امراؤ بیگم کے بیٹے تھے۔ وہ حسین میرزا کے ہم زلف تھے۔ گویا ان کی شادی بھی ضمیر الدولہ جلیل الملک افتخار الامرا حسین نظام خاں بہادر مستقیم جنگ کی ایک صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ عباس میرزا، یوسف میرزا اور وزیر میرزا ان کے بیٹے تھے۔ جو یوسف میرزا حسین میرزا کے بھانجے تھے وہ اور صاحب تھے۔

نہیں دکھایا۔ مگر عندالاستفسار کہا گیا کہ خط حسین میرزا صاحب کو لکھتا ہوں۔ انھوں نے کہا میرا سلام لکھنا کہ یہاں سب خیر و عافیت سے ہیں اور سب کو دعا سلام کہتے ہیں۔ یوسف میرزا کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ اس وقت سردار میرزا سے دریافت ہو گیا کہ عباس مرزا کے نام کا تمھارا رقعہ ان کو پہنچ گیا۔

شنبہ ۲۹- اکتوبر ۱۸۵۹ء

(۴)

جناب عالی، کل آپ کا خط لکھا ہوا سہ شنبہ یکم نومبر کا پہنچا۔ لطف یہ کہ کل وہی سہ شنبہ کا دن ۸- نومبر کی تھی۔ آج بدھ کا دن ۹- نومبر کی صبح کے وقت میں تم کو خط لکھنے بیٹھا تھا کہ برخوردار یوسف مرزا کا خط لکھا ہوا ۳- نومبر کا پہنچا۔ اب میں دونوں خطوں کا جواب باہم لکھتا ہوں۔ دونوں صاحب باہم پڑھ لیں ۱۲-

مرزا آغا جانی صاحب اچھی طرح ہیں۔ ان کو تپ آگئی تھی، اب تپ مفارقت کر گئی ہے، مگر ضعف باقی ہے۔ آج چوتھا دن ہے کہ میرے پاس آئے تھے۔ کاشی ناتھ مرا، مہر پر ہوتی کرتا ہے۔ نوندرائے پاس سر رشتہ سودا۔ محمد تقی خاں اکثر علی جی رہتے ہیں۔ کبھی یہاں آجاتے ہیں، تب نوندرائے کو تاکید کرتے ہیں۔ آج کل یہاں پنجاب احاطے کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ پون ٹوٹی کے باب میں کونسل ہوئی، پرسوں، نومبر جاری ہو گئی۔ ساگ رام خزانچی، چھنامل، مہیش داس، ان تین شخصوں کو یہ کام بطور امانی سپرد ہوا ہے۔ غلے اور اپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے۔ خلق کا ازدحام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہو گیا کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ نہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ سے کرایے کے مکان میں رہتے تھے، وہ بھی آرہیں، مگر کرایہ سرکار کو دیں۔ تم انصاف کرو کہ ہمشیر کی

درخواست کیوں کر گزرے، جب وہ خود آئیں اور درخواست دیں اور منظور ہو اور مکان ملے تو اس تمام شہرستان ویران میں سے ایک حویلی ملے گی اور ان کو یہاں رہنا ہوگا۔ کیوں کر اس ویرانے میں تنہا رہیں گی؟ سہم کر دم نکل جائے گا۔ مانا کہ جبراً اختیار کر کر رہیں، کھائیں گی کہاں سے؟ بہرحال یہ سب خیالاتِ خام اور جملے ناتمام ہیں۔ ہاں نقل لینی اور مرافعہ نہ کرنا اور نقل حکم لینی اور پھر مرافعہ کرنا اور پھر اس حکم کی نقل لینی، یہ امور ایسے نہیں کہ جلد فیصل ہو جائیں۔ حکام بے پروا، مختار عدیم الفرصت، میں پا شکستہ۔ محمد قلی خاں کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ وقت پر موقوف ہے۔ گھبراؤ نہیں حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات شہران کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ۔ دروازے سے باہر نہ نکلو، اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔ نواب[۱] حامد علی خاں کے مکانات سب ضبط ہو گئے۔ وہ قاضی کے حوض میں کرایے کے مکانات میں مع ممتوعہ کے رہتے ہیں۔ باہر جانے کا حکم ان کو بھی نہیں۔ مرزا الٰہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے انھوں نے زمین پکڑی ہے۔ سلطان جی میں رہتے ہیں۔ عذر کر رہے ہیں۔ دیکھیے یہ جبر اٹھ جائے یا یہ خود اٹھ جائیں[۲]۔

۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء

(۵)

نواب صاحب،

آج تیسرا روز ہے کہ حال تم کو لکھ چکا ہوں، محمد قلی خاں آئے۔ ہم میں اُن میں

---

[۱] غالب کے عزیز دوست اعتماد الدولہ میر فضل علی کے بھانجے اور داماد۔ یہ اصل میں قصبہ برست کے رہنے والے تھے جو پانی پت کے پاس ہے۔ میر فضل علی لکھنؤ جا کر ترقی کرتے کرتے نصیر الدین حیدر کے زمانے میں نائب السلطنت بن گئے۔

[۲] یعنی دیکھیے یہ حکم واپس ہو جائے یا وہ تعمیل حکم پر مجبور ہو جائیں۔

باہم گفتگو ہوئی۔ نواب گورنر کی آمد میں کچہریاں بند، حکام میرٹھ کو چلے جاتے ہیں۔ ۱۹ یا ۲۰ دسمبر کو میرٹھ مخیم خیام ہوگا۔ دربار وہیں ہوگا۔ رہا دِلّی کا آنا، مشتبہ فیہ ہے۔ کوئی کہتا ہے نہ آئیں گے، کوئی کہتا ہے جریدہ بسبیل ڈاک آئیں گے۔ کوئی کہتا ہے مع لشکر آئیں گے، ۱۳ دن یہاں رہیں گے۔ آج ۱۵ دسمبر کی ہے، جو کچھ واقع ہوگا وہ تم کو لکھوں گا۔ نقل حکم کی درخواست اور اس مقدمہ کی فکر بعد اس ہنگامہ کے عمل میں آئے گی۔ خاطر عاطر جمع رہے۔

تمھارا دوست[۱] بھی حسب الحکم کمشنر ہانسی حصار کل یا پرسوں میرٹھ کو جائے گا۔ اور ادھر سے امین الدین خاں بھی وہاں آئے گا۔ میرا دربار اور خلعت دریا برد ہو گیا۔ نہ پنسن کی توقع، نہ دربار اور خلعت کی صورت، نہ سزا نہ انعام، نہ رسم معمولی قدیم۔

یوسف مرزا کو دعا پہنچے۔ پرسوں کلو جو تا لے آیا۔ کل دونوں طرف سے کھُلا ہُوا لے کر گیا، ڈاک کے کار پردازوں نے اُلٹا پھیر دیا اور کہا کہ پولندہ بنا لاؤ۔ پولندہ بنا کر لے گیا کہا بارہ پر دو بجے سے لیا جائے گا۔ بیٹھا رہا۔ رات کے نو بجے اس کے سامنے روانہ ہوا۔ رسید لے کر اپنے گھر آیا۔ خدا کرے تم کو پہنچ جائے اور پسند آئے۔ قصیدے[۲] کے باب میں مَیں مایوس مطلق ہوں۔ مگر جو کچھ واقع ہو بطریقِ خبر لکھ بھیجنا۔ مثنوی "بادِ مخالف"[۳] کی رسید تمھاری تحریر سے معلوم ہو گئی۔ فیل خانہ، فلک پیرا، سعد اللہ خاں کی ڈگی کے محاذی کے مکانات سب گرائے گئے۔ بلاقی بیگم کا کوچہ التوا میں ہے،

۱۔ اشارہ بظاہر ضیاء الدین احمد خاں نیر کی طرف ہے اس لیے کہ اگلی سطر میں امین الدین احمد خاں ثانی لوہارو کا ذکر ہے۔

۲۔ اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک قصیدہ واجد علی شاہ کی مدح میں لکھ کر بھیجا گیا تھا۔ وہ اگرچہ معزول ہو کر کلکتہ پہنچ چکے تھے، لیکن غالب کبھی کبھی لکھنؤ کے مجتہد صاحب کی وساطت سے ان کی مدح میں قصیدہ بھیج دیتے تھے۔

۳۔ غالب کی فارسی مثنوی جو کلکتہ میں ادبی ہنگامہ برپا ہونے کے سلسلے میں بطور معذرت لکھی گئی تھی جس میں غالب نے بعض اعتراضات کا جواب دیا تھا نیز فارسی زبان کے باب میں اپنا مسلک واضح کیا تھا۔

اہلِ فوج ڈھانا چاہتے ہیں، اہلِ قلم بچاتے ہیں۔ پایانِ کار دیکھیے کیا ہو۔
جمعہ ۱۶۔ دسمبر ۱۸۵۹ء

(۶)

نواب صاحب،

پرسوں صبح کا تمھارا خط پہنچا۔ پہر دن چڑھے لارڈ صاحب کا لشکر آیا۔ کابلی دروازے کی فصیل کے قریب، بھورو شاہ کی قبر کے سامنے، خیمۂ خاصہ برپا ہوا اور باقی لشکر تیس ہزاری باغ تک اُترا ہے۔ پنجشنبہ ۲۹۔ دسمبر ۱۸۵۹ء۔ آپ غالب کی مصیبتوں کی داستان سُنیے۔ پرسوں تمھارا خط پڑھ کر لشکر کو گیا۔ میر منشی سے ملا۔ اُن کے خیمہ میں بیٹھ کر صاحب سکرتر بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کلو بھی گیا۔ جواب آیا کہ ہمارا اسلام دو اور کہو کہ فرصت نہیں ہے۔ خیر میں اپنے گھر آیا۔ کل پھر گیا، خبر کروائی۔ حکم ہوا کہ غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے، اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو؟ عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ یہ جواب پیامِ نومیدیِ جاوید ہے۔ نہ دربار، نہ خلعت، نہ پنسن۔ انّا للہ و انا الیہ راجعون۔ بقیہ خبرِ لشکر یہ ہے کہ راجا بھرت پور برات لے کر پٹیالے گیا تھا اور اس سبب سے آگرے میں لارڈ صاحب سے نہیں ملا تھا۔ ایک ہفتے سے معاودت کر کے یہاں آیا ہوا تھا۔ آج اس کی ملازمت ہے۔

شنبہ ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء گیارہ بجے ہوں گے۔ میں خط لکھ رہا ہوں، توپیں چل رہی ہیں۔ شاید راجہ صاحب کی ملاقات اسی وقت ہوئی۔ کل یک شنبہ ہے،

۱۔ یعنی عسکری اور کشوری لوگ۔ غدر کے بعد شہر کا انتظام کچھ مدت تک فوجیوں کے ہاتھ میں رہا۔ پھر کشوریوں یعنی محکمہ نظم و نسق کے ہاتھ آیا۔ اُوپر کے فقرے میں جن مقامات کا نام آیا ہے وہ دہلی کے مختلف محلّے تھے۔

پرسوں دوشنبہ کو یا سہ شنبہ کو لارڈ صاحب کا کوچ ہے۔ کہتے ہیں کہ پشاور تک جائیں گے۔

کل صبح کو محمد قلی خاں آئے۔ ایک عرضی انگریزی ان کے ہاتھ میں۔ کہنے لگے یہ عرضی طالب علی فیل بان نے مجھ کو پھیر دی ہے اور کہا ہے کہ اس کے گزراننے کا موقع نہیں۔ نیز اس وقت سوار ہوا چاہتا تھا۔ تمھاری یاس سن کر گیا، اپنا داغِ حسرت جبیں جو یہاں تک آیا ہوں لے کر گیا۔

ابراہیم علی خاں الور میں مستسقی ہو کر مر گئے، خدا ان کو بخشے اور مجھ کو بھی یہ نصیب کرے۔ کمشنر صاحب کا نائب یہاں کوئی نہیں اور نہ کسی انگریزی خواں سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اتنا مسموع ہوا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضۂ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور یہ حکم ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں[1] نے لوٹا ہے، البتہ اس کا معاوضہ بحساب دہ یک سرکار سے ہوگا، یعنی ہزار روپیہ کے مانگنے والے کو سو روپیہ ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہدر اور بحل ہے۔ اس کا معاوضہ نہ ہوگا۔ شاید یہ وہی کمشنر ہوں۔ مکانات کو حامد علی خاں کا کہہ کر کیوں لکھتے ہو، وہ تو مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہوگیا۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے تھے، اب پھاٹک اور سرتاسر دکانیں گرا دی گئیں۔ سنگ و خشت کا نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکان کا ملبہ بکا ہے، سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا۔ جب بادشاہ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے؟ تم اب تک سمجھے نہیں ہو کہ حکام لیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے۔ کیسا نوندرائے، کیسی نقل حکم، کیسا مرافعہ۔

---

[1] یعنی ان سپاہیوں نے جنھیں انگریز باغی کہتے تھے۔

جو احکام کہ دلی میں صادر ہوئے ہیں، وہ احکام قضا و قدر ہیں ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ اب یوں سمجھ لو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے، نہ جاہ و حشم رکھتے تھے، نہ املاک تھے، نہ پنشن رکھتے تھے۔ رام پور زندگی میں میرا مسکن اور بعد مرگ میرا مدفن ہو لیا۔ جب تم لکھتے ہو کہ اللہ تم وہاں جاؤ تو مجھ کو ہنسی آتی ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ہلال ماہ رجب المرجب رام پور میں دیکھوں۔ جو تدبیر وثیقے[۱] کے باب میں تم نے کی ہے، وہ بہت مناسب ہے۔ بشرط پیش ہونے کے اور ولایت پہنچنے کے، سجاد مرزا اور اکبر مرزا[۲] اپنی پیرانہ سری میں اس پر قابض ہو رہیں گے۔ انشاءاللہ العلی العظیم۔

یوسف مرزا خاں کو دعا پہنچے۔ حال قصیدہ و مخمس کا معلوم ہُوا۔ قبلہ و کعبہ وہ کر رہے ہیں جو اباً اولاد سے اور آقا غلام سے سلوک کرتا ہے۔ ان کو منظور ہے کہ دعا کا عطیہ جُدا پاؤں اور ثنا کا صلہ جُدا پاؤں:

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما

لیکن میری جان، انصاف تو کر ان صلوں میں زندگی تو بسر نہیں ہوتی۔ یہ فکر بھی بےہودہ ہے۔ زندگی میری کب تک؟ سات مہینے یہ اور بارہ مہینے سال آئندہ[۳] کے

۱۔ وثیقے کا مطلب یہ ہے کہ شاہان و بیگمات کا ایک دستور یہ تھا کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو بڑی بڑی رقمیں بہ طور قرض دے دیتے تھے اور ان کے سود کی رقم اپنے مختلف عزیزوں، متوسلوں اور ملازموں کے نام لکھ دیتے تھے۔ یہ رقمیں کمپنی کے خزانے سے ان لوگوں کو ملتی رہتی تھیں۔ اصطلاح میں اسے "وثیقہ" کہتے تھے۔ حسین مرزا اور ان کے بھائی مظفر الدولہ کو بھی لکھنؤ سے غالباً پانچ پانچ سو روپے ماہوار بہ طور وثیقہ ملتے تھے، جو غدر میں ضبط ہو گئے۔ حسین مرزا نے اس کی بحالی کی کوئی تدبیر اختیار کی جس کی تفصیل غالب نے نہیں بتائی۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حسین مرزا اس کے لیے ولایت میں چارہ جوئی کے خواہاں تھے۔

۲۔ حسین مرزا کے فرزند۔

۳۔ یہ خط رجب ۱۲۷۶ھ میں لکھا گیا۔ مرزا غالب کا خیال تھا وہ ۱۲۷۷ھ میں مر جائیں گے۔ ایک قطعہ تاریخ وفات بھی انھوں نے کہا تھا جو دوسری جگہ نقل ہو چکا ہے۔

اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں وہاں نہ روٹی کی فکر، نہ پانی کی پیاس نہ جاڑے کی شدّت، نہ گرمی کی حدّت، نہ حاکم کا خوف، نہ مخبر کا خطرہ، نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے، نہ کپڑا خریدنا پڑے۔ نہ گوشت گھی منگاؤں، نہ روٹی پکواؤں۔ عالم نور اور سراسر سرور:

یارب ایں آرزوے من چہ خوش است   تو بدیں آرزو مرا برسان

روز سہ شنبہ ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء   بندۂ علی ابن ابی طالب آرزومند مرگ غالبؔ

نواب یوسف میرزا

(۱)

کوئی ہے؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب وہ آئے۔ میاں میں نے کل خط تم کو بھیجا ہے مگر تمھارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے، اب سن لو: تفضل حسین خاں اپنے ماموں موید الدین خاں کے پاس میرٹھ ہے، شاید دلی آیا ہو، مگر میرے پاس نہیں آیا۔ والد اُن کے غلام علی خاں اکبرآباد میں ہیں۔ مکتب داری کرتے ہیں، لڑکے پڑھاتے ہیں، روٹی کھاتے ہیں۔ تم لکھتے ہو کہ پچاس محل واجد علی شاہ کے کلکتے گئے۔ تمھارے ماموں[۱] محمد قلی خاں کے خط میں لکھتے ہیں کہ شاہ اودھ بنارس آگئے۔ اس خبر کو اس خبر کے ساتھ منافات نہیں ہے، اُدھر سے آپ بنارس کو چلے ہوں، اِدھر سے بیگمات کو وہاں بلایا ہو۔ مگر میری جان ہم کو کیا:

---

[۱] حسین میرزا۔

عالم ہمہ مرگ ما چہ دریا چہ سراب

(۱۸۵۸ء)

(۲)

اے میری جان، اے میری آنکھیں:

ز ہجران طفلے کہ در خاک رفت   چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو اور ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے، اولاد بہت۔ نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو؟ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے؟ ہاں مظفر الدولہ[۱] کا غم منجملۂ واقعات کربلائے معلّیٰ ہے۔ یہ داغ ماتم جیتے جی نہ مٹے گا۔ والد کی خدمت بجا لانے کا ہرگز افسوس نہ چاہیے۔ کچھ ہو سکتا ہو اور نہ کیا ہو تو مستحق ملامت ہوئے۔ کچھ ہو ہی نہ سکے تو کیا کرو۔ اب تو فکر یہ پڑی ہوئی ہے کہ رہیے کہاں اور کھائیے کیا؟ مولانا[۲] کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا، کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا۔ بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کا بیٹا[۳] ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے؟ جو ہونا تھا، سو ہو لیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ناظر جی کو سلام کہنا اور کہنا کہ حال اپنا مفصل تم کو لکھ چکا ہوں۔ وہ دہلی

---

[۱] یوسف مرزا کا بڑا ماموں حسین میرزا کا بڑا بھائی مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں جو غدر میں مارا گیا
[۲] مولانا فضل حق خیر آبادی
[۳] مولوی عبدالحق خیر آبادی

اُردو اخبار کا پرچہ اگر رل جائے تو بہت مفید مطلب ہے ورنہ خیر کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے حکامِ صدر ایسی باتوں پہ نظر نہ کریں گے۔ مَیں نے سکہ کہا نہیں، اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے، سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانبدار نہیں۔

لو، حضرت میر عنایت حسین صاحب کل آئے۔ میر انفس حسین کا خط دے دیا۔ عینک لگا کر خوب پڑھا۔ کہہ گئے ہیں کہ اس کا جواب کل لاؤں گا۔ مَیں تو صبح کو یہ خط روانہ کرتا ہوں، وہ آج یا کل جب خط لاویں گے، اس کو جداگانہ لفافہ میں روانہ کردوں گا۔ مظفر مرزا دیکھیے کب تک آوے اور مجھ سے کیوں کر ملے۔ ایک لطیفہ پرسوں کا سنو۔ حافظ ممّو بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے، حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں، املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا، صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوے۔ مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا: حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ مَیں۔ پھر پوچھا حافظ ممّو کون؟ عرض کیا کہ مَیں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے، ممّو ممّو مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممّو بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مثل داخلِ دفتر ہوئی۔ میاں ممّو اپنے گھر چلے آئے۔

ہاں صاحب، خواجہ بخش درزی کل سہ پہر کو میرے پاس آیا۔ مَیں نے جانا ایک ہاتھی کوٹھے پر چڑھ آیا ہے۔ کہتا تھا کہ آغا صاحب کو میری بندگی لکھ بھیجنا۔ میرن صاحب آج کل پانی پت کو جایا چاہتے ہیں۔ میر کاظم علی ابن میر قلندر علی الور سے آئے ہوے

سلطان جی میں اُترے ہوئے ہیں۔ دن پندرہ ایک ہوئے، محمد قلی خاں میری ملاقات کو آئے تھے۔ علی جی میں رہتے ہیں۔ رضا شاہ پاٹودی گئے ہوئے ہیں۔ میر اشرف علی ابن میر اسد علی مرحوم نے رہائی پائی۔ ابھی املاک کی درخواست نہیں دی ہماری بھابی صاحبہ یعنی زوجہ میر احمد علی خاں مغفور اپنی حویلی میں چین کر رہی ہیں ایک آدھ دن میں جاؤں گا۔ خدا جانے جمعہ کے دن ناظر جی کی درخواست پہ کیا گزری۔ اس وقت تک ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ دھیان لگا ہوا ہے زیادہ کیا لکھوں۔

(جون ۱۸۵۹ء)

(۳)

میری جان، خدا تیرا نگہبان،

مَیں نے "گرڑپھنک"[1] کو دام میں پھنسایا، پھر قفس میں بند کر کے یہ رقعہ لکھوایا میر ارتضیٰ حسین کو فقط ان کے نام کی جو عبارت ہے وہ پڑھا دینا تاکہ ان کی خاطر جمع ہو جائے۔ مثنوی کبھی اصلاح نہ پائے گی، جب تک سب نہ آئے گی۔ لاکھ باتیں بناؤ، مجھ کو غیرت دلاؤ، غزل جب تک پوری نہ ہو، قصیدہ جب تک تمام نہ ہو، مثنوی جب تک سب نہ لکھی ہو، کیوں کر اصلاح دی جائے؟ اپنے چھوٹے ماموں صاحب کو میر اسلام باعتبار محبت کے اور بندگی باعتبار سیادت کے اور دعا باعتبار یگانگی اور استادی کے کہتا اور کہنا کہ بھائی اور کیا لکھوں؟ جس حکم کی نقل کے واسطے تم لکھتے ہو وہ اصل کہاں ہے کہ جس کی نقل لوں؟ ہاں زبان زد خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے باز پرس نہیں۔ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ اے لو کئی دن ہوئے کہ حمید خاں گرفتار آیا ہے، پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، حوالات میں ہے دیکھیے حکم اخیر کیا ہو۔ صرف نوندرائے کی مختار کاری پر قناعت کی گئی، جو کچھ ہونا ہے وہ ہو رہے گا۔ ہر شخص کی سرنوشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے،

[1] یعنی گرڑپنکھ

نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی دو بہنیں سو سو روپے مہینا پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمھارے بھائی مجرم تھے تمھاری پنشن ضبط۔ بطریق ترحم دس دس روپے مہینا تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا! میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس، پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔ ۵۳ برس کا پنسن، تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک اور بہ منظوری گورنمنٹ، اور پھر نہ ملا ہے، نہ ملے گا۔ خیر احتمال ہے ملنے کا۔ جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں۔ اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے، نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بعض لوگ یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ اس مہینے میں پنسن کی تقسیم کا حکم آجائے گا۔ دیکھیے کہ آتا ہے یا نہیں اگر آتا ہے تو میں مقبولوں میں ہوں یا مردودوں میں۔ مظفر مرزا کا خط الور سے آگیا۔ بخیر و عافیت پہنچے۔ میر قاسم علی کا قافلہ بھی وہیں ہے۔ میر قاسم علی کی بی بی الور کی تنخواہ میں سے بموجب سہام شرعیہ دو ثلث مظفر مرزا کو اور ایک ثلث اپنے کو تجویز کرتی ہے۔ ظاہرا بموجب تعلیم میر قاسم علی کے ہے

محررہ جمعہ ۱۲۔ ذی الحجہ و ۱۵ جولائی سال حال

۱۲۷۵ھ - ۱۸۵۹ء غالب

(۴)

میاں،

پرسوں قریب شام میاں آغا جانی صاحب آئے۔ وہ اور ان کے متعلق سب اچھی طرح ہیں۔ حسنو بیگ ہانسی گئے۔ کل تمھارا خط آیا۔ بھائی تمھیں خارش کیوں ہوئی؟

حسین مرزا صاحب کیوں بیمار ہوئے ؟ خدایا اُن آوارگان دشت غربت کو جمعیت؛ جب تو چاہے عنایت کر، مگر تصدق مرتضیٰ علی کا تندرست رکھ۔ اللہ اللہ حسین مرزا کی ڈاڑھی سفید ہوگئی۔ یہ شدّت غم و رنج کی خوبیاں ہیں۔ اِس خط کے پہنچتے ہی اپنی اور ان کی خیر و عافیت لکھنا۔ جہاں تم نے اپنے نام کا خط پڑھا وہاں کا حال یہ ہے:

بہ گفت احوال ما برق جہاں است — دمے پیدا و دیگر دم نہاں ست

گہے بر طارم اعلے نشینم — گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

ہمارے خداوند ہیں، قبلہ و کعبہ ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے ایک بنائے قدیم، رفیع مشہور، اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا؟ یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں: ایک ٹھنڈی سڑک، ایک آہنی سڑک[1]۔ محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعے کے آگے جہاں لال ڈگی ہے ایک میدان نکالا جائے گا۔ محبوب کی دکانیں، بہیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے سے خاص بازار تک، یہ سب میدان ہو جائے گا۔ یوں سمجھو کہ امو جان کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے سنگ عمارت باقی نہ رہیں گے۔ آج جان نثار خاں کے چھتّے کے مکان ڈھنے شروع ہو گئے ہیں۔ کیوں میں دلّی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں؟ جب اہلِ شہر ہی نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں؟

حسین مرزا صاحب کو میرا سلام کہنا۔ یہ رقعہ پڑھا دینا۔ ان کا خط موسومہ محمد قلی خاں آیا۔ کلو کے ہاتھ ان کے گھر بھجوایا۔ ان کا گھر کہاں؟ وہ تو میر احمد علی خاں

---

[1] یعنی ریلوے لائن۔

مرحوم کی بی بی کے ہاں رہتے ہیں۔ وہ نہ تھے۔ جب بھابی صاحبہ کو معلوم ہوا کہ میرے دیور کا آدمی ہے، انھوں نے مدعا دریافت کر کے خط رکھ لیا اور کالو سے کہا کہ بھائی کو سلام کہنا کہ محمد تقی خاں علی جی گئے ہوئے ہیں۔ خط ان کے پاس بھجوا دوں گی۔ کل رضا شاد آئے تھے۔ میں نے ان کو کہا تھا کہ تم میر احمد علی خاں کی بی بی کو تاکید کر دینا کہ خط ضروری کا ہے اس کو بہ احتیاط پہنچا دینا۔

صاحب تمھاری انّا کو میں کیا جانوں؟ کس پتے سے ڈھونڈوں؟ دوا سے میں نے پوچھا۔ امیر النسا کو وہ نہ سمجھی، واجد علی کی ماں کر کے پہچانا۔ سو وہ کہتی تھی کہ واجد علی مع اپنی ماں کے پہاڑ گنج ہے۔

ہمشیرہ کی عرضی کے روانہ ہونے کا حال معلوم ہوا۔ تم سمجھو اگر وہ عرضی تحقیقت کمشنر نے بھیج دی ہے، تو بے شک مدعا سے ساتھ قبول کر کے بھیجی ہے۔ اگر خود نہ منظور کرتا تو کبھی نہ بھیجتا۔ باقر علی اور حسین علی اپنی دادی کے ساتھ ضیاء الدین خاں کی والدہ کے پاس قطب صاحب گئے ہوئے ہیں۔ ایاز اور نیاز علی ان کے ساتھ ہیں۔ دو بندگیاں اور ایک دعا اور دو آداب ملتوی۔ ددا اور کلو اور کلیان کی بندگیاں پہنچیں۔ قمر الدین خاں پرسوں آیا تھا، اب آئے گا تو دعا تمھاری اس کو کہہ دوں گا۔

۲۸۔ جولائی ۱۸۵۹ء غالب

(۵)

حق تعالیٰ تمھیں عمر و دولت و اقبال و عزت دے۔ خط محررہ دوم میں کوئی مطلب جواب طلب نہ تھا۔ مرزا حیدر صاحب کی رحلت کی خبر تھی اور بس۔ کل بدھ کا دن، دونوں مہینوں کی، اتاریخ تھی۔ صبح کے وقت مرزا آغا جانی صاحب آئے اور انھوں نے فرمایا کہ حسین مرزا کی حرم لکھنؤ سے آئی تھی، بی فتن کے ہاں اتری تھی۔

اب وہ پاٹودی کو اپنے بیٹے کے پاس گئی کہتی تھی کہ نصیب اعدا ناظر جی بہت بیمار ہیں۔ خدا خیر کرے، یوسف میرزا میری جان نکل گئی۔ کیا کروں؟ کیوں کر خبر منگاؤں؟ "یا علی" "یا علی" "یا علی" دس بارہ بارہ دل میں کہا ہوگا کہ مداری کا بیٹا دوڑا ہوا آیا اور تین خط لایا۔ یعنی وہ نیچے حویلی میں تھا۔ ڈاک کے ہرکارے نے خط لاکر دیئے۔ نیاز علی اُوپر لے آیا۔ ایک خط یار عزیز کا اور ایک خط ہرگوپال تفتہ کا اور ایک خط ذوالفقار حیدر مولوی کا۔ میاں؎ قریب تھا کہ خوشی کے مارے مجھ کو رونا آجائے۔ بارے اس خط کو میں نے آنکھوں سے لگایا، مچھیاں لیں۔ اب تم تماشہ دیکھو۔ ۱۳ محرم کا خط ۱۷ کو مجھے پہنچا۔ اس میں مندرج کہ جمعے کے دن ۱۹ کو بسبیل ڈاک کلکتے جاؤں گا اور پھر حضرت مجھ سے مطلب کا جواب مانگتے ہیں۔ ہاں جب کلکتے پہنچ لیں گے اور وہاں سے مجھ کو خط بھیجیں گے اور اپنے مسکن کا پتہ لکھیں گے، تب جو کچھ مجھ کو لکھنا ہوگا، لکھوں گا۔ آغا صاحب کو سب خط سُنا دیا اور ان کو اسی وقت کاشی ناتھ کے پاس بھیجا ہے، تاکہ وہ اس کو گرمائیں اور شرمائیں اور کچھ سجاد میرزا کے واسطے بھجوائیں۔ ضیاء الدین خاں دو ہفتے سے یہاں ہیں۔ اپنے باغ میں اُترے ہوئے ہیں۔ دو بار میرے پاس بھی دو دو گھڑی کے واسطے آئے تھے۔ کچھ ان کو منظور ہے رعایتِ اخلاص و محبّتِ قدیم، خدا چاہے تو کچھ سجاد میرزا کو اور کلکتے سے ان کے خط کے آنے کے بعد کچھ ناظر جی کو اُن سے بھجواؤں۔

میرا وہی حال ہے۔ بھُوکا نہیں ہوں، مگر کسی خدمت گزاری کی توفیق نہیں ہے، اگر کہوں تو کون باور کرے؟ اور وہ بات خود کہنے کی نہیں، کرنے کی ہے، سو کرنے کا مقدور نہیں۔ تفضل حسین خاں ابن غلام خاں میرٹھ میں اپنے ماموں صاحب کے پاس ہے۔ شہر میں آیا تھا۔ میرے پاس بھی آیا تھا۔ تمھارا سلام کہہ دیا۔ پرسوں پھر وہ

۱؎ حسین میرزا۔

میرٹھ گیا۔ بھائی فضلو عرب سرا میں رہتے ہیں۔ پرسوں سے آئے ہوئے ہیں۔ ڈھونڈتے ہیں۔ عرضیاں دیتے پھرتے ہیں، کوئی سُنتا نہیں۔ تم کو سلام کہتے ہیں۔ آمدورفت کا ٹکٹ موقوف ہوگیا۔ فقیر اور ہتھیار جس پاس ہو، وہ نہ آئے اور باقی ہندو، مسلمان، عورت، مرد، سوار، پیادہ، جو چاہے چلا آئے، چلا جائے۔ بغیر آبادی کے ٹکٹ کے، رات کو رہنے نہ پائے۔ وہ شور و غل تھا کہ سڑکیں نکلیں گی اور گوروں کی چھاؤنی بنے گی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ مرپٹ کر ایک جان نثار خاں کے چھتے کی سڑک نکلی، دِلّی والوں نے لکھنؤ کا خاکہ اُڑا رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ لاکھوں مکان ڈھا دیئے اور صاف میدان کر دیا۔ مَیں جانتا ہوں، ایسا نہ ہوگا، بات اتنی ہی ہے جو تم نے لکھی ہے بہرحال اب جو کچھ ہو لکھو اور ناظر جی کے روانہ ہو جانے کی خبر اور سجاد اور اکبر اور اس کی ماں کی خیریت اور اپنے باپ کا حال لکھو۔

پنجشنبہ ۱۸ محرم الحرام ۱۲۷۶ھ و ۱۷- اگست ۱۸۵۹ء

(۶)

میری جان شکوہ کرنا سیکھو۔ یہ باب مَیں نے تم کو ابھی پڑھایا نہیں۔ کوئی خط تمہارا نہیں آیا کہ مَیں نے اسی دن یا دوسرے دن جواب نہ لکھا ہو۔ بلکہ مَیں ایسا جانتا ہوں کہ یہ جو تم نے مجھ کو شکایت نامہ بھیجا ہے اس کے بعد ایک خط میرا ابھی تم کو پہنچا ہوگا۔ یہ خط کل آیا، آج میں اس کا جواب لکھتا ہوں۔ سنو صاحب تم جانتے ہو کہ میں ۱۴ پارچہ کا خلعت ایک بار اور ملبوس خاص شال رومال دوشالہ ایک بار پیشگاہ حضرت سلطانِ عالم[1] سے پا چکا ہوں۔ مگر یہ بھی جانتے ہو کہ وہ خلعت مجھ کو دوبار کس کے ذریعہ سے ملا ہے؟ یعنی جناب قبلہ وکعبہ حضرت مجتہد العصر مدظلہ العالی۔ اب آدمیت اس کی مقتضی نہیں ہے کہ مَیں بغیر ان کے توسط کے مدح گستری کروں

---

[1] واجد علی شاہ

چنانچہ قصیدہ لکھ کر اور جیسا کہ میرا دستور ہے، کاغذ بنوا کر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔ یقین ہے کہ حضرت نے وہاں بھیج دیا ہوگا اور میں تم کو بھی لکھ چکا ہوں کہ میں نے قصیدہ لکھنؤ کو بھیج دیا ہے۔ اسی خط میں یہ بھی تم کو لکھا ہے کہ حضرت زبدۃ العلماء سید نقی صاحب اگر کلکتے پہنچ گئے ہوں تو مجھ کو اطلاع دو۔ دارو غگی املاک کے باب میں جو مناسب اور معقول اور واقعی ہے وہ میں بے پردہ عالیشان مظفر حسین خاں کے خط میں لکھتا ہوں۔ یہ ورق پڑھ کر ان کی خدمت میں گزران دو اور جو وہ ارشاد کریں مجھ کو لکھو۔ تمھارے اس خط کے مطالب مندرجہ کا جواب ہو چکا۔ اس سے زیادہ میرے پاس کوئی بات اس وقت لکھنے کو نہیں ہے۔ مگر یہ کہ ایک خط تمھارے ماموں صاحب کے نام کا بھیج چکا ہوں اگر وہ پہنچے گا اور خدا کرے پہنچے تو اس سے تم کو ایک حال معلوم ہوگا۔

شنبہ ۵۔ نومبر ۱۸۵۹ء غالب

(۷)

یوسف میرزا،

میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے، بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت۔ غمِ مرگ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کرکے اہلِ شہر کو گنتا ہوں: مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا انیس برس کا بچہ، مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضےٰ خاں اور مرتضےٰ خاں، قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو۔ بھول گیا، حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش،

اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟ غم فراق: حسین مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے۔ گھران کے بے چراغ، وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصوّر کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔ حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مرگیا۔ اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج اور اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں! اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیئے۔

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلو، کلیان، ایاز یہ باہر مداری کی جورو بچے بدستور۔ گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے مہینا بھر سے آگئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم[1] سے کچھ آئے جاتا ہے وہ بقدر سد رمق ہے محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت نہیں، ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟ بڑھاپا، ضعف قوے۔ اب مجھ کو دیکھو تو جانو میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ گویا صاحب فراش ہوں۔ نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق[2] جو بقدر طاقت بنائے رکھتا

۱۔ یعنی رام پور سے

۲۔ شراب

تھا اب میسّر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا، خلعتِ فاخرہ پاتا تھا، وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں، نہ مردود ہوں، نہ گنہ گار ہوں۔ نہ مخبر، نہ مفسد۔ بھلا اب تم ہی کہو اگر یہاں دربار ہوا اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں؟ دو مہینے میں ماتت خونِ جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا۔ محمد افضل مصوّر کو دیا، وہ پہلی دسمبر کو مجھ کو دے گا۔ یہ اس کا مطلع ہے:

زسالِ نو دگر آئین بروئے کار آمد
ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آمد

اس میں التزام اپنی تمام سرگزشت کے لکھنے کا کیا ہے۔ اس کی نقل تم کو بھیجوں گا۔ میرے آقازادۂ روشن گہر جناب مفتی میر عباس صاحب کو دکھانا۔ اس بجھے ہوئے بلکہ مرے ہوئے دل پر کلام کا یہ اسلوب ہے۔

جہاں پناہ[۱] کی مدح کی فکر نہ کرسکا۔ یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرا نہ تھا، مَیں نے اسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ مَیں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کر دیا، تو کیا غضب ہُوا۔ پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت میں کہ جس کا ذکر بطریقِ اختصار اُوپر لکھ آیا ہوں۔ اس قصیدے سے مجھ کو عرضِ دستگاہ سخن منظور نہیں گدائی منظور ہے۔ بہ ہر حال یہ تو کہو قصیدہ پہنچا یا نہیں؟ پرسوں تمھارے ماموں کا خط آیا، اس میں قصیدے کا ذکر نہیں۔ اس تفرقہ کو مٹاؤ اور صاف لکھو کہ قصیدہ پہنچا یا نہیں؟ اگر پہنچا تو حضور میں گزرا یا نہیں؟ اگر گزرا تو کس کی معرفت گزرا؟ اور کیا حکم ہُوا؟ یہ امور جلد لکھو اور ہاں یہ بھی لکھو کہ

۱۔ واجد علی شاہ۔

املاک واقع شہر دہلی کے باب میں کیا حکم ہوا۔

میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ کل میں نے فردِ فہرستِ دیہات و باغات و املاک مع حاصلِ ہر یک باغ ودہ و ملک، ناظر جی کو بھیج دی ہے۔ اس خط سے ایک دن پہلے وہ فرد پہنچے گی۔ یہ فرد کلکٹری کے دفتر سے لی ہے۔ مگر اتنا معلوم ہے کہ شہر کی عمارت جو سڑک میں نہیں آئی اور برسات میں ڈھے نہیں گئی وہ سب خالی پڑی ہے۔ کرایہ دار کا نام نہیں۔ مجھ کو یہاں کی املاک کا علاقہ حسین میرزا کے واسطے مطلوب ہے۔ میں تو پنشن کے باب میں حکم اخیر سُن لوں پھر رام پور چلا جاؤں گا جمادی الاول سے ذی الحجہ تک ۸ مہینے اور پھر محرم سے ۱۲۷۸ھ سال شروع ہوگا اس سال کے دو چار، حد دس گیارہ مہینے غرضکہ انیس بیس مہینے ہر طرح بسر کرنے ہیں۔ اس میں رنج و راحت، ذلت و عزت جو مقسوم میں ہے، وہ پہنچ جائے اور پھر علی علی کہتا ہوا ملکِ عدم کو چلا جاؤں جسم رام پور میں اور روح عالمِ نور میں "یا علی" "یا علی" "یا علی"

میاں ہم تمھیں ایک اور خبر لکھتے ہیں۔ برھما کا پسر دو دن بیمار پڑا تیسرے دن مر گیا۔ ہے ہے کیا نیک بخت غریب لڑکا تھا۔ باپ اس کا شیو جی رام اس کے غم میں مردہ سے بدتر ہے۔ یہ دو مصاحب میرے یوں گئے۔ ایک مردہ، ایک دل افسردہ۔ کون ہے جس کو تمھارا سلام کہوں؟ یہ خط اپنے ماموں صاحب کو پڑھا دینا اور فرد ان سے لے کر پڑھ لینا اور جس طرح ان کی رائے میں آتے اس پر حصولِ مطلب کی بنا اٹھانا اور ان سب مدارج کا جواب شتاب لکھنا۔

ضیاء الدین خاں رہتک چلے گئے اور وہ کام نہ کر گئے۔ دیکھیے آ کر کیا کہتے ہیں[1] یا رات کو آ گئے ہوں یا شام تک آ جائیں۔ کیا کروں کس کے دل میں اپنا دل ڈالوں

---

[1] یعنی خندہ شہ میں ان سے کچھ روپے سجاد میرزا اور حسین میرزا کو بھجوانے کا جو خیال تھا وہ پورا نہ ہوا۔

بمرتضیٰ علی پہلے سے نیّت میں یہ ہے کہ جو شاہ اودھ سے ہاتھ آئے، حصہ برادرانہ کروں۔ نصف حسین مرزا اور تم اور سجاد، نصف میں مفلسوں کا مدار، حیات۔ خیالات پر ہے۔

والسلام خیر ختام۔

دوشنبہ دوم جمادی الاول ۱۲۷۶ھ د ۲۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء وقت صبح

(۸)

میاں،

صبح کو تمہارے نام کا خط روانہ کیا شام کو تمہارا ایک خط اور آیا۔ حضرت زبدۃ العلما کا اب تک وہاں نہ پہنچنا تعجب کی بات ہے۔ حق تعالیٰ ان کو، جہاں رہیں، اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ جب چاہیں وہاں پہنچیں۔ میرا مقصود تو اتنا ہی ہے کہ قصیدہ گزرے۔ اور کچھ ہمارے تمہارے ہاتھ آئے۔ لیکن کل کے خط کی پشت پر جو سطریں ناظر جی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں، ان کے دیکھنے سے آس ٹوٹ گئی۔ کچھ ہاتھ آتا نظر نہیں آتا۔

املاک واقع شہر دہلی کے سوال کا جواب اب کی بار قلم انداز ہوا کہ اگر کہا جائے گا تو بے شک یہ جواب آئے گا کہ ہم نے تو عوض ان مکانات کے یہ مکانات دیئے، معاوضہ ہوگیا۔ بھائی میں پہلے ہی جانتا تھا کہ یہ املاک قتل ہوئی اور وہ سوا لاکھ روپیہ جو علاوہ زر مقررہ ملا ہے وہ دلّی کی املاک کا خونبہا ہے۔ پرسوں ناظر جی کے نام کے سرنامے میں فرد فہرست مجموع املاک بھیج چکا ہوں۔ مگر خیر یہ وار بھی خالی گیا۔ ملا نا غالب علیہ الرحمۃ خوب فرماتے ہیں:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید   نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

تمہارے ماموں صاحب کی دستخطی تحریر نے جو میرا حال کیا ہے، وہ کس زبان سے ادا

کروں؟ ہے ہے حسین مرزا اور یہ کہے کہ مَیں کہاں جاؤں اور کیا کروں اور مجھ کم بخت سے اس کا جواب سرانجام نہ ہو سکے؟ بہت بڑا آسرا تھا اور سرکار کی خدمت نہ سہی، عہدہ نہ سہی، علاقہ نہ سہی، سو ڈیڑھ سو روپیہ درماہہ مقرر ہو جانا کیا مشکل تھا؟ دلّی کے آدمی خصوصاً امرائے شاہی ہر شہر میں بدنام اتنے ہیں کہ لوگ ان کے سایے سے بھاگتے ہیں۔ مرشد آباد بھی ایک سرکار تھی۔ حیدرآباد بہت بڑا گھر ہے، مگر بے ذریعہ و واسطہ کیوں کر جائیے اور جائے تو کس سے ملے؟ کیا کہے؟ ناچار یہیں رہو۔ کسی طرح شاہ اودھ کا سامنا ہو جائے۔ اور مَیں کہاں کی صلاح بتاؤں؟ وہ صاحب[1] رہتک گئے ہیں، کل یقین ہے کہ آ گئے ہوں گے مجھے ابھی خبر نہیں آئی۔ اگر مشیت الٰہی میں ہے تو دسمبر مہینے میں کچھ ظہور میں آ جائے گا۔ نواب گورنر جنرل بہادر یقین ہے کہ آج آگرہ میں رونق افروز ہوں گے۔ الور، جے پور، دھول پور، گوالیار، ٹونک، جاورہ چھ رئیسوں کی وہاں ملازمت کی خبر ہے۔ خیر ہم کو کیا؟ لیث الدولہ حسین علی خاں بہادر کی خدمت میں میرا سلام نیاز اور شکریاد آوری۔
مرقومہ صبح سہ شنبہ ۲۹ نومبر، ۳ جمادی الاول بحساب جنتری۔
(سنہ ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء)

(۹)

میاں تمہارا خط رام پور پہنچا اور رام پور سے دلّی آیا۔ مَیں ۲۳ شعبان کو رام پور سے چلا اور ۳۰ شعبان کو دلّی پہنچا۔ اسی دن چاند ہوا۔ یکشنبہ رمضان کی پہلی، آج دوشنبہ ۹ رمضان کی ہے۔ سوانواں دن مجھے یہاں آئے ہوئے ہے۔ میں نے حسین مرزا کو رام پور سے لکھا تھا کہ یوسف مرزا کو میرے آنے تک الور نہ جانے دینا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ وہ میرا خط ان کو تمہاری روانگی کے بعد پہنچا۔ جو مجھ کو اپنے

---

[1] ضیاء الدین احمد خاں۔

ماموں کے مقدمہ میں لکھنے ہو کیا مجھ کو ان کے حال سے غافل اور ان کی فکر سے فارغ جانتے ہو؟ کچھ بنا ڈال آیا ہوں۔ اگر خدا چاہے تو کوئی صورت نکل آئے۔ اب تم کہو کہ کب تک آؤ گے؟ صرف تمھارے دیکھنے کو نہیں کہتا، شاید تمھارے آنے پر کچھ کام بھی کیا جائے۔ مظفر مرزا کا اور ہمشیرہ صاحبہ کا آنا تو کچھ ضرور نہیں، شاید آگے بڑھ کر کچھ حاجت پڑے۔ بہ ہر حال جو ہو گا وہ سمجھ لیا جائے گا۔ تم چلے آؤ۔ ہمشیرہ عزیزہ کو میری دعا کہہ دینا۔ مظفر مرزا کو دعا پہنچے۔ بھائی تمھارا خط رام پور پہنچا۔ ادھر کے چلنے کی فکر میں جواب نہ لکھ سکا۔ بخشی صاحبوں کا حال یہ ہے کہ آغا سلطان پنجاب کو گئے۔ جگراؤں میں منشی رجب علی[۱] کے مہمان ہیں۔ صفدر سلطان اور یوسف سلطان وہاں ہیں۔ نواب مہدی علی خاں بقدر قلیل بلکہ اقل کچھ ان کی خبر لیتے ہیں۔ میر جلال الدین خوش نویس اور وہ دونوں بھائی باہم رہتے ہیں۔ میں وہیں تھا کہ صفدر سلطان دلّی کو آئے تھے۔ اب جو میں یہاں آیا تو سنا کہ وہ میرٹھ گئے۔ خدا جانے رام پور جائیں یا کسی اور طرف کا قصد کریں۔ تباہی ہے، قہر الٰہی ہے۔ مجھ کو لڑکوں نے بہت تنگ کیا، ورنہ چند روز اور رام پور میں رہتا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

مرقومہ دوشنبہ ۹۔ رمضان و ۲۔ اپریل
(۱۲۷۶ھ و ۱۸۶۰ء)
راقم غالب

---

[۱] سید رجب علی ارسطو جاہ جو پہلے پنجاب میں میر منشی تھے۔ غدر کے زمانے میں انگریزوں کے رفیق خاص اور معتمد علیہ کارکن رہے۔ جگراؤں ضلع لدھیانہ میں اقامت تھی۔ ایک مطبع بھی قائم کیا تھا غدر کے بعد ان کا گھر شرفا دہلی کا مامن بنا رہا۔ مفتی صدر الدین آزردہ مرحوم جب اپنے املاک کی بازیافت کے لیے چارہ جوئی کی غرض سے لاہور آئے تھے تو ارسطو جاہ ہی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد بھی دہلی سے نکلے تھے تو انھیں کے پاس مقیم ہوئے، بعد ازاں لاہور پہنچے۔

(۱۰)

آؤ صاحب، میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ آج یک شنبہ کا دن ہے ساتویں تاریخ شوال[1] کی اور انیسویں اپریل کی۔ صبح کو بھائی فضلو جن کو میر کاظم علی بھی کہتے ہیں اور ہم نے احتلام الدولہ خطاب دیا ہے وہ تین پاؤ کھجوریں اور ایک ٹین کا لوٹا اور دو سوت کی رسیاں لے کر، بھٹیارے کے ٹٹو پر سوار ہو کر الور کو روانہ ہوئے۔ پہر دن چڑھے ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط میرے نام کا اور ایک حکمنامہ محکمۂ لاہور موسومہ میر کاظم علی لایا۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ تمہارے ماموں صاحب مع سجاد مرزا تشریف لائے۔ تمہارا خط ان کو دے دیا۔ وہ اس کو پڑھ رہے ہیں اور میں یہ خط تم کو لکھ رہا ہوں پہلے تو یہ لکھتا ہوں کہ حکمنامہ میر کاظم علی کو دے دینا اور میری طرف سے تعزیت کرنا کہ خیر بھائی صبر کرو اور چپ ہو رہو۔ تاریخ کے دو قطعوں میں ایک قطعہ رہا۔ "ماہ خوش خرام" کی جگہ "ماہ۔رخ خوش خرام" بنا دیا ہے۔ قطعہ اچھا ہے بشرط آنکہ متوفیہ کا شوہر یہ الفاظ اپنی زوجہ کے واسطے گوارا کرے۔ خواجہ جان[2] جھوٹ بولتا ہے۔ والی رام پور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔ یہ کام خدا ساز ہے، بہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔ ناظر جی[3] نے تمہارے قول کی تصدیق کی اور کہا کہ ہاں مسودہ عرضی کا میرے پاس آگیا، میں تم کو دکھاؤں گا۔ خیر تم نے جو لکھا ہوگا وہ مناسب ہوگا۔ خدا اس لائے اور کام بن جائے۔ الگزانڈر ہدرلے صاحب میرے دوست کے فرزند ہیں اور نیک بخت اور سعادت مند ہیں۔ میر کاظم علی وغیرہ کی تنخواہ میں میری سپارش کو دخل نہیں

---

[1] رمضان عام نسخوں میں چھپا ہوا ہے اسے سہو کاتب یا سہو صاحب مکاتیب سمجھنا چاہیے۔

[2] شمس الدین خواجہ جان برادر بدر الدین خواجہ امان۔

[3] حسین مرزا۔

ہے، تم میر کاظم علی سے دریافت کر لو۔ ہاں دو مقدموں ہیں میں نے ان کو دو خط لکھے، مگر انھوں نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا اور ان مقدموں میں کوشش بھی نہیں کی۔ اب اس کو سمجھ کر، جو کچھ تم لکھو اس کے موافق عمل میں لاؤں۔ ناظر جی صاحب اور سجاد مرزا اپنے گھر گئے۔ وہ تم کو دعا اور سجاد بندگی کہہ گیا ہے۔ اپنے آنے میں جلدی نہ کرو۔ ماں کی رضا جوئی کو سب امور پر مقدم جانو۔ میں ابھی رام پور نہیں جاتا۔ برسات کے بعد بشرطِ حیات جاؤں گا۔ یعنی اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر میں قصد ہے۔ یقین ہے کہ یہ خط دو دن میر کاظم علی کے پہنچنے سے پہلے تمھارے پاس پہنچے، ان کے نام کا حکم نامہ بہت احتیاط سے اپنے پاس رہنے دینا۔ خبردار جاتا نہ رہے۔ جب وہ پہنچیں تب ان کو حوالہ کرنا۔ صاحب نے خمس نذر یہ باتیں غیریت کی ہیں۔ جس طرح اپنے اور بچوں کو دوں گا، مظفر میرزا اور تم کو بھی اسی طرح بھجوا دوں گا۔ ہمشیرہ عزیزہ کو یعنی اپنی والدہ کو میری دعا کہنا۔

مرقومہ یک شنبہ وقت نیم روز ہفتم شوال ۲۹۔ اپریل
(۱۲۷۶ھ۔ سنہ ۱۸۶۰ء) غالب

۱۱

یوسف مرزا کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ تمھارا خط کل منگل کو پہنچا۔ آج بدھ ۱۷۔ شوال اور ۹۔ مئی کی ہے۔ اس کا جواب بھیجتا ہوں۔ خدا کی قسم تامس ہٹلے[۱] صاحب سے میری ملاقات نہیں ہے۔ ہاں الگز صاحب سے ہے۔ سو ان کے نام کا خط لکھا ہوا تم کو بھیجتا ہوں، پڑھ کر بند کر کر ان کو دو اور ان سے ملو۔ اور جو کچھ وہ کہیں مجھ کو لکھو۔ احتلام الدولہ بھائی فضلو میر کاظم علی بہادر کیا جانے کہ کتاب کس کو کہتے ہیں اور آگرہ کس ہتھیار کا نام اور سکندرہ کون ہے

---

[۱] تامس کا بھائی الگزاندر ہدرلے۔

درخت کا پھل ہے۔ میرا اُردو کا دیوان میرٹھ کو گیا۔ سکندر شاہ لے گئے، مصطفےٰ خاں کو دے آئے۔ ڈاک میں اس کی رسید آگئی۔ نہ برہان قاطع نہ قاطع برہان۔ کل جس وقت تمھارا خط آیا، اس وقت منشی میر احمد حسین میرے پاس بیٹھے تھے، اور اس وقت سالک مجذوب بیٹھا ہوا ہے۔ یہ دونوں صاحب تم کو اور بھائی فضلو کو سلام کہتے ہیں اور بھائی فضلو سے یہ کہہ دینا کہ باتفاق رائے منشی میر احمد حسین اب باغ کی درخواست کی عرضی بے فائدہ، بلکہ مضر ہے۔ تمھارا کاغذ قیمتی ایک روپیہ کا منشی جی کے پاس موجود ہے، وہ اس کو بیچ کر روپیہ تم کو بھجوا دیں گے۔

۱۷۔ شوال (۱۲۷۶ھ) و ۹۔ مئی (۱۸۶۰ء)

(۱۲)

یوسف مرزا،

کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ[۱] مر گیا۔ اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی، دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا، یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ۔ ہاں صاحب وہ لکھتے ہیں کہ پنشن

---

[۱] یوسف میرزا کے باپ کا نام محمد نصیر تھا۔ وہ لکھنؤ میں رہتا تھا۔

کا روپیہ مل گیا تھا۔ وہ تجہیز و تکفین کے کام آیا۔ یہ کیا بات ہے؟ جو مجرم ہو کر ۱۴ برس کو مقید ہوا ہو اس کا پنشن کیوں کر ملے گا اور کس کی درخواست سے ملے گا؟ رسید کس سے لی جائے گی؟

مصطفےٰ خاں[1] کی رہائی کا حکم ہوا۔ مگر پنسن ضبط۔ ہر چند اس پرسش سے کچھ حاصل نہیں۔ لیکن بہت عجیب بات یہ ہے کہ تمھارے خیال میں جو کچھ آئے وہ مجھ کو لکھو۔ دوسرا امر یعنی تبدیل مذہب عیاذاً باللہ۔ علی کا غلام کبھی مرتد نہ ہوگا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ حضرت چالاک اور سخن ساز اور ظریف تھے سوچے ہوں گے کہ دموں میں اپنا کام نکالو اور رہا ہو جاؤ۔ عقیدہ کب بدلتا ہے اگر یہ بھی تھا تو ان کا گمان غلط تھا۔ اس طرح رہائی ممکن نہیں۔ قصّہ مختصر تمھاری دادی کا خط جو تمھارے بھائی نے مجھ کو بھیجا تھا، وہ میں نے تمھارے ماموں کے پاس بھیج دیا۔ ان کی جا داد کی واگزاشت کا حکم تو ہو گیا ہے، اگر ان کے بڑے بھائی کے یار ان کو چھوڑیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ مظفر مرزا کو دعا پہنچے۔ تمھارا خط جواب طلب نہ تھا۔ تمھارے چچا کا آغاز اچھا ہے، خدا کرے انجام اسی آغاز کے مطابق ہو۔ ان کا مقدمہ دیکھ کر تمھاری پھوپھی کا اور تمھارا سرانجام دیکھا جائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ ہوگا کیا؟ اگر جا دادیں مل بھی گئیں تو قرضدار دام دام لیں گے۔ رازق حقیقی پنسن دلوادے کہ روٹی کا کام چلے۔ جناب میر قربان علی صاحب کو میرا سلام نیاز اور میر کاظم علی کو دعا۔

مرقومہ شنبہ ۲۷۔ شوال سنہ ۱۲۷۶ھ و ۱۹۔ مئی سال حال سنہ ۱۸۶۰ء غالب

---

[1] شیفتہ

نواب سجاد میرزا

(۱)

خوبیٔ دین و دُنیا تم کو ارزانی، تمھارے خط کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوگئیں، دلِ کو چین آگیا۔ چشم بددُور، خط اچھا، عبارت اچھّی۔ اُردو میں مطلب نویس اچھے ہو حق تعالیٰ تم کو عمر و دولت عطا کرے۔ اپنے والدِ ماجد کو سلام کہنا۔ اپنے بھائی مظفر میرزا کو دعا کہنا۔ زیادہ زیادہ

نجات کا طالب غالبؔ ۱۲ — مارچ ۱۸۶۶ء روز چہار شنبہ

(۲)

زبدۂ آلِ رسولؐ سجاد میرزا خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دُعا۔ دلنوازنامہ پہنچا:

حیران اطوارِ خودم، درماندۂ کارِ خودم ہر لحظہ دارم نیّتے چوں قرعۂ رمالہا

تمھارے یار باقر میرزا[1] تحصیلداری تحصیلداری پکارتے تھے، یہاں معلوم ہُوا کہ تمام قلمرو میں چھ تحصیلداریاں اور چھ تھانہ داریاں ہیں۔ ساتواں علاقہ کہاں سے پیدا کیا جائے؟ رہی مصاحبت، اس کو پہلے تسنّن[2] اور پھر علوم رسمیہ سے آگہی، پھر زبان آوری، پھر قسمت کی یاوری شرط ہے۔ باقر علی خاں کو تین شرطیں درکار، پہلی شرط موجود۔ تم کو پہلی شرط[3] ازلاً و ابداً مفقود۔ بعدِ جشن[4]،

---

[1] ابن زین العابدین عارفؔ۔

[2] یعنی سنّی ہیں۔ لیکن نہ علوم رسمیہ سے آگاہ ہیں۔ نہ زباں آور، نہ قسمت کے یاور۔

[3] یعنی تم شیعہ ہو۔

[4] اس سے مراد نواب کلب علی خاں کا جشن مسند نشینی ہے جو اواخر ۱۸۶۵ء میں رام پور میں ہوا تھا۔

وقت رخصت ان دونوں لڑکوں[1] کے باب میں خاطر جمع[2] اور ظفر میرزا اور تمھارے باب میں، محمد میرزا ابن سیف الدولہ اور میاں زکی الدین اور میاں عبدالسلام کے باب میں کلام کروں گا:

تا بنگر بد خواستہ کردگار چیست

نواب میر غلام بابا خاں

نواب میر غلام بابا خاں عرف چھوٹے صاحب سورت کے رئیس تھے۔

ان کے جد اعلیٰ میر جمال الدین عرف خواجہ دانا ترکستان سے اکبر کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ ان کی اولاد میں سے خواجہ ابوالحسن ۱۱۲۶ھ میں فوت ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے: فیض الحسن اور نورالاعلیٰ۔ یہ اصحاب ذکر و فکر تھے۔ ایک فرزند "سید اخی" کے بیٹے میر غلام بابا خاں تھے۔ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں پیدا ہوئے۔ خان بہادر اور سی آئی ای کا خطاب پایا۔ ۱۲ شوال ۱۳۱۰ھ (۱۹ اپریل ۱۸۹۳ء) کو فوت ہوئے۔ کسی صاحب نے تاریخ وفات کہی جس کے بعض شعر یہ ہیں:

سید آل نبی ترمذی اولاد حسین — نقشبندی سندے بود غلام بابا
الف و پنجاہ دو و صد بود سنہ از ہجری — روز شعباں شدہ مولود غلام بابا
روح پیر بد شب دوازدہم در شوال — رحمۃ اللہ ذوی الجود غلام بابا
عمر مرحوم شدہ شصت کہ بس پیک اجل — گفت برخیز بہ معبود غلام بابا

---

[1] باقر علی اور حسین علی فرزندان عارف۔

[2] حسین میرزا

از سرِ ہفت فلک گفت چو عنوانِ تاریخ ۔۔۔ بہ جناں آمد و آسود غلام بابا

سنہ ۱۳۱۱ھ میں ایک ماذنہ بنوایا تھا جس کی تاریخ یہ تھی:

ندوے بانگ بگو بر عمود دینِ نبیؐ ۔۔۔ دوبارہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

نواب صاحب بڑے خلیق، حلیم، سلیم، متواضع اور متحمل مزاج بزرگ تھے۔

دو بیٹے یادگار چھوڑے۔

غالب کے ساتھ روابط میاں داد خاں سیاح کی وساطت سے پیدا ہوئے جو نواب صاحب کے مصاحب بن گئے تھے۔

(۱)

سبحان اللہ تعالیٰ شانہ ما اعظم برہانہ۔ جناب مستطاب نواب میر غلام بابا خان بہادر سے بتوسط میاں داد خاں صاحب شناسائی بہم پہنچی۔ لیکن واہ! "اوّل ساغر و دردی" کیا جگر خون کن اتفاق ہے۔ پہلا عنایت نامہ جو حضرت کا مجھ کو آیا، اس میں خبرِ مرگ۔ اب میں جو اس کا جواب لکھوں، اور یہ میرا پہلا خط ہوگا، لامحالہ مضامین اندوہ انگیز ہوں گے۔ نہ نامۂ شوق، نہ محبت نامہ، صرف تعزیت نامہ۔ صریرِ قلم ماتمیوں کے شیون کا خروش ہے جو لفظ نکلا وہ سیاہ پوش ہے ہے ہے نواب میر جعفر علی خاں[۱] جیسا امیر روشن گہر نام آور۔ روشناس اعیان ہند و انگلینڈ وسط جوانی یعنی ۴۶ برس کی عمر میں یوں مر جائے:

نخلِ چمن سروری افتاد زپا ہائے

سچ تو یوں ہے کہ یہ دہر آشوب غم ہے، مجموع اہل سند ماتم دار و سوگوار ہوں تو بھی کم ہے۔ اگرچہ میں کیا اور میری دعا کیا مگر اس کے سوا نہ مغفرت کی دعا کروں کیا کروں؟

---

[۱] نواب میر جعفر علی خاں، نواب میر غلام بابا خاں کے خسر تھے۔ یعنی ان کی پہلی بیوی رحیم النسا بیگم عرف چھوٹی بیگم کے والد۔

قطعہ سال رحلت نواب غفران مآب، جب دل خار خار غم سے پر خون ہوا، یوں موزوں ہوا۔

گردید نہاں مہر جہانتاب دریغ　　شد تیرہ جہاں بچشم احباب دریغ
ایں واقعہ را ز روے زاری غالبؔ　　تاریخ رقم کرد کہ "نواب دریغ"

"روے زاری" یعنی زاء ہوز کے عدد بڑھائے جائیں تو ۱۲۸۰ھ پیدا ہوتے ہیں، ہٰذا المطلوب۔ شریک بزم ماتم منشی میاں داد خاں صاحب کو سلام۔

یکشنبہ بست و یکم ربیع الاول ۱۲۸۰ھ مطابق ششم ستمبر ۱۸۶۳ء

(۲)

بجناب نواب صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام مسنون الاسلام و دعاے دولت و اقبال کہ ہمیشہ ورد زبان ہے، گھڑی کے عطیہ کا شکر ہر گھڑی اور ہر ساعت بجالاتا ہوں۔ پہلے تو آپ دوست اور پھر امیر اور پھر سیّد۔ نظر ان تین امور پر اس ارمغاں کو میں نے بہت عزیز سمجھا اور اپنے سر اور آنکھوں پر رکھا۔ خداے عالم آراے آپ کو سلامت رکھے اور ہر گھڑی آپ کا ممد و مددگار رہے۔ ظاہرا، بوقت روانگی کنجی کا رکھنا سہو گیا۔ خیر یہاں بن جائے گی والسلام بالوف الاحترام۔

سہ شنبہ سوم دسمبر ۱۹۶۴ء　　خوشنودی احباب کا طالب غالبؔ

(۳)

جناب نواب صاحب،

آپ کے اخلاق کا شاکر اور آپ کی یاد آوری کا ممنون اور آپ کے دوامِ دولت کا دعاگو ہوں۔ اگر بوڑھا اور اپاہج نہ ہوتا، تو ریل کی سواری میں مقرر آپ تک پہنچتا۔ اور آپ کے دیدار سے مسرت اندوز ہوتا۔ آپ میرے شفیق اور میرے

محسن ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت باکرامت رکھے۔ خط کے دیر دیر لکھنے کا سبب ضعف و نقاہت ہے۔ اگر میری اوقات شبانہ روزی اور میرے حالات آپ دیکھیں تو تعجب کریں گے کہ یہ شخص جیتا کیوں کر ہے۔ صبح سے شام تک پلنگ پر پڑے رہنا اور پھر دمبدم پیشاب کو اٹھنا۔ ان مجموع مصائب میں سے ایک ادنےٰ مصیبت یہ ہے کہ ۱۲۸۲ھ ہجری شروع ہوئی ۱۲۱۲ھ کی ولادت ہے۔ اب کے رجب کے مہینے سے سترھواں سال شروع ہوگا۔ سترا بہترا، بہرا، بوڑھا، اپاہج آدمی ہوں۔ جو عنایت تم میرے حال پر فرماتے ہو، صرف تمھاری خوبی ہے۔ میں کسی لائق نہیں۔

چہار شنبہ ۳۱ - مئی ۱۸۶۵ء — نجات کا طالب غالب

(۴)

نواب صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان، امید گاہ درویشاں، زاد افضالکم

آپ کا بندۂ منت پذیر غالب خونیں صفیریوں نواسنج ہوتا ہے کہ عنایت نامہ عز ورود لایا اور مژدۂ قبول سے میرا رتبہ بڑھایا۔ جو کچھ میرے حق میں ارشاد ہوا، اگر اس کو قدردانی کہوں تو لازم آتا ہے کہ اپنے کو ایک طرح کے کمال کا مالک جانتا ہوں۔ البتہ آپ نے از راہِ حق پسندی سخن کی قدردانی اور میری قدر افزائی کی ہے۔ جو اغلاط فارسی دانان ہند کے ذہن میں راسخ ہو گئے تھے ان کو دفع کیا ہے تو کیا برائی کی ہے۔ بات یہ ہے کہ اوچھی پونجی والے گمنام، اپنی شہرت کے لئے مجھ سے لڑتے ہیں۔ واہ واہ، اپنے نامور بنانے کو ناحق جھگڑتے ہیں۔ عطیہ حضرت بتوسط جناب سیف الحق[1] پہنچا۔ اور میں نے اس کو بے تکلف

---

[1] میاں داد خاں سیاح جنھیں غالب نے سیف الحق خطاب دیا تھا۔ یہ سو روپے کے عطیہ کی طرف اشارہ ہے جو غالب کو بہ توسط سیاح "قاطع برہان" کی طبع ثانی کے لئے پہنچا تھا۔

عطیہ مرتضوی سمجھا۔ علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثنا آپ کا دادا اور میرا آقا۔ خدا کا احسان ہے کہ میں احسان مند بھی ہُوا تو اپنے خداوند کے پوتے کا۔ آج سے کاپی لکھی جانے لگی اور تصحیح کو میرے پاس آنے لگی۔ چھاپے کے واسطے برسات کا موسم اچھا ہے بس اب اس کے چھپ جانے میں دیر کیا ہے۔

صبح یکشنبہ ۱۷ ستمبر ۱۸۶۵ء　　　　نجات کا طالب غالبؔ

(۵)

نواب صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان، سلامت۔

فقیر اسد اللہ عرض کرتا ہے کہ آپ کے خط کے آنے نے میری آبرو بڑھائی۔ حق تعالیٰ تمھیں سلامت رکھے۔ ۳۶ "درفش کاویانی" کی رسید پہنچی۔ حسب الارشاد اب اور نہ بھیجوں گا۔ قبلہ غرض شہرت ہے، اس قلمرو میں میں نے جلدیں تقسیم کی ہیں، اس ملک میں آپ بانٹ دیں۔ اتنی میری عرض قبول ہو کہ بڑودہ، گجرات میں سیّد احمد حسن صاحب مودودی اور میر ابراہیم علی خاں صاحب کو ایک ایک جلد بھجوا دیجیے گا، اور چھ جلدیں مولانا سیف الحق کو عطا کیجیے گا کہ وہ اپنے دوستوں کو بھجوا دیں۔

خواجہ بدرالدین خاں[۲] میرے بھتیجے نے بوستانِ خیال کو اُردو میں لکھا ہے۔ اس کا ایک اشتہار اور یہاں ایک اخبار نیا جاری ہونے والا ہے اس کے دو

---

[۱] "قاطع برہان" کا نام طبع ثانی میں غالبؔ نے "درفش کاویانی" رکھا تھا۔

[۲] خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان ابن خواجہ حاجی، جن کی والدہ غالبؔ کی بہن کی نند تھی یعنی خواجہ حاجی کی شادی میرزا جیون بیگ سبز پوش کی صاحبزادی سے ہوئی تھی اور انھیں کے بطن سے خواجہ امان اور ان کے بھائی خواجہ جان پیدا ہوئے۔ اور غالبؔ کی بہن چھوٹی بیگم میرزا جیون بیگ کے صاحبزادے میرزا اکبر بیگ سے بیاہی گئی تھی۔ اس بنا پر خواجہ امان کو میرزا نے بھتیجا لکھا۔

اشتہار اس خط کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ آپ یا آپ کے احباب میں سے کوئی صاحب کتاب کے یا اخبار کے خریدار ہوں، تو اشتہار کے مضمون کے مطابق عمل میں لائیں۔
والسلام مع الاکرام میاں سیف الحق کو سلام۔

۲۲- مارچ ۱۸۶۰ء

(۶)

نواب صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان نواب میر غلام بابا صاحب بہادر زاد مجدہٗ
عرض کیا جاتا ہے کہ آپ کا عنایت نامہ اور مولانا سیف الحق کا مہربانی نامہ دونوں لفافے ایک دن پہنچے۔ سیف الحق کے خط سے معلوم ہوا کہ رجب کے مہینے میں شادیاں قرار پائی ہیں۔ مبارک ہو اور مبارک ہو۔ نظارۂ بزم جمشیدی سے محروم رہوں گا، مگر میرا حصہ مجھ کو پہنچ رہے گا، خاطر جمع ہے۔
کیوں حضرت صاحبزادے کا اسم تاریخی پسند آگیا یا نہیں؟ نام تاریخی اور پھر سیّد بھی اور خان بھی۔ سید مصاحب علی خاں عجب ہے اگر پسند نہ آئے اور بہت عجب ہے کہ اس امر کی نہ آپ کے خط میں توضیح نہ میاں داد خاں کے خط میں خبر۔ یہ میں نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی یہی نام رکھیے۔ پسند آنے یا نہ آنے کی تو فقیر کو اطلاع ہو جائے۔

۹- ماہ اگست ۱۸۶۰ء جواب کا طالب غالب

(۷)

ستودہ بہر زبان و ناموَر بہر دیار، نواب صاحب شفیقِ کرم گستر، مرتضوی تبار، نواب میر غلام بابا خاں بہادر کو مسرت بعد مسرت و جشن بعد جشن مبارک و ہمایوں ہوا۔ رقعہ کانگوں نے بہار کی سیر دکھلائی۔ بسواری ریل روانہ ہونے کی ہر دل میں آئی۔ پانوٴں سے اپاہج، کانوں سے بہرہ، ضعفِ بصارت، ضعف دماغ، ضعفِ دل، ضعفِ معدہ۔ ان سب ضعفوں پہ ضعفِ طالع۔ کیوں کر قصدِ سفر کر دوں۔ تین چار شبانہ روز قفس میں کس

طرح بسر کروں[۱]، گھنٹہ بھر میں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ایک ہفتے دو ہفتے کے بعد ناگاہ قولنج کے دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں، حالت جان میں نہیں، آنا میرا سورت تک کسی صورت حیز امکان میں نہیں۔خط لکھتے لکھتے خیال میں آیا کہ سید صاحب کی ولادت کی تاریخ لکھی۔ سیدانی صاحبہ کی بسم اللہ کی تاریخ بھی لکھا چاہیے۔مادہ "خجستہ بہار" ذہن میں آیا۔سات عدد کم پائے۔ "خجستہ بہار" پر ادب کے اعداد بڑھائے شمار میں ۱۲۸۳ نظر آئے۔ دوسرے ورق پر وہ قطعہ مرقوم ہے۔بوڑھوں کی فکر کی طاقت معلوم ہے، صرف جوش محبت سے چار مصرعے موزوں ہوئے ہیں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف +

۱۴۔نومبر ۱۸۶۶ء راقم اسداللہ خاں غالب

سیف الحق صاحب کو سلام۔ ایک میرے دوست مصور خاکسار کا خاکہ اتار کر دربار کا نقشہ اتارنے کو اکبرآباد گئے ہیں، وہ آجائیں تو شغل تصویر تمام ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے۔خط ازراہ احتیاط بیرنگ بھیجا جاتا ہے

قطعہ:

خجستہ جشن دبستاں نشینی بیگم — بفیض ہمت تو باب دمین اقبالش
چو از پئے ادب آموزی است خوش باشد — اگر "خجستہ بہار ادب" بود سالش

۱۴۔نومبر ۱۸۶۶ء

---

[۱] یعنی ریل کی سواری میں تین چار روز تک کیوں کر بند بیٹھا رہوں۔ غالب کے کمال تحریر کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ ضمناً آپ اپنے عہد کے حالات بتا جاتے ہیں۔مثلاً یہ کہ ریل اس زمانے میں دہلی سے تین چار روز میں سورت پہنچتی تھی۔

(۸)

نواب صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان، عالی شان، والا دودمان، زاد مجدکم۔

سلام مسنون الاسلام و دعاے دوام دولت و اقبال کے بعد عرض کیا جاتا ہے کہ ان ایام میمنت فرجام میں جو از روے اخبار بمبئی آپ کی افزایش عز و جاہ کے حالات معلوم ہوئے، متواتر شکر الٰہی بجالایا اور اس ترقی کو اپنی دعا کا نتیجہ جان کر اور زیادہ خوش ہوا۔ خصوصاً عدالت العالیہ میں فتح پانا اور حق حقیقی کا ظہور میں آنا، کیا کہوں (کس قدر) مسرت و شادمانی کا موجب اور کس طرح کی نشاط و انبساط کا سبب ہوا ہے۔ حق تعالیٰ یہ فتح مبارک و ہمایوں کرے[۱]۔ قطعہ

فتحِ سید غلام بابا خان — خود نشانِ دوامِ اقبال ست

ہم ازیں رو بود کہ غالب گفت — کہ "ظفر نامۂ ابد سال ست"

بہار باغ جاہ و جلال جاوداں باد

(رمارچ ۱۸۶۷ء) — اسد اللہ خاں غالب

(۹)

نواب صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان عنایت فرماے مخلصاں، زاد مجدہٗ۔

شکر یاد آوری و رواں پروری بجالاتا ہوں۔ پہلے اس سے آپ کا مودت نامہ پہنچا ہے، وہ میرے خط کے جواب میں تھا۔ اس کا جواب نہیں لکھا گیا۔ پرسوں میاں سیف الحق کا خط پہنچا۔ خط کیا تھا خوانِ دعوت تھا۔ مَیں نے کھانے بھی کھائے، میوے بھی کھائے، ناچ بھی دیکھا، گانا بھی سُنا۔ خدا تم کو سلامت رکھے کہ اس نالائق درویشِ گوشہ نشین پر اتنی عنایت کرتے ہو۔ صاحبا! ریاست و امارت میں ایسے جھگڑے بہت رہتے ہیں۔ بسبب فرطِ محبت اخبار میں تمھاری افزایش

۱؎ یہ ایک خاندانی مقدمے میں کامیابی کا ذکر ہے۔ جیسا کہ اگلے خط سے ظاہر ہے۔

عزّ و جاہ دیکھ کر خوش ہُوا اور تم کو تہنیت دی۔"ظفر نامۂ ابد" بہت مبارک لفظ ہے۔
انشاءاللہ العلی العظیم ہمیشہ مظفر و منصور رہو گے:

کارت بجہاں جملہ چناں باد کہ خواہی

سہ شنبہ ۳۔اپریل ۱۸۶۷ء نجات کا طالب غالب

۱۰

جناب سیّد صاحب قبلہ

بعد بندگی عرض کرتا ہوں کہ عنایت نامہ آپ کا پہنچا آپ جو فرماتے ہیں کہ تو اپنی خیریت کبھی کبھی لکھا کر، آگے اتنی طاقت باقی تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا، اب وہ طاقت بھی زائل ہوگئی۔ہاتھ میں رعشہ پیدا ہوگیا،بینائی ضعیف ہوگئی۔ متصدی نوکر رکھنے کا مقدور نہیں۔عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی صاحب وقت پر آگئے، تو مَیں مطلب کہتا گیا، وہ لکھتے گئے۔یہ حسن اتفاق ہے کہ کل آپ کا خط آیا، آج ہی ایک دوست میرا آگیا کہ یہ سطریں لکھوا دیں اور یہ آپ کبھی نہ فرمائیں کہ منشی میاں داد خاں سے مجھے قطع محبت ہوگیا ہے۔منشی صاحب کی محبت اور ان کے توسط سے آپ کی محبت دل و جاں میں اس قدر سما گئی ہے، جیسا اہلِ اسلام میں ملکہ ایمان کا۔پس ایسی محبّت کا موقوف ہونا کبھی ممکن نہیں۔ امراضِ جسمانی کا بیان اور اخلاصِ ہمدگر کی شرح کے بعد ہجومِ غم ہائے نہانی کا ذکر کیا کروں؟ جیسا ابر سیاہ چھا جاتا ہے، یا ٹڈی دل آتا ہے۔پس اللہ ہی اللہ ہے سیف الحق منشی میاں داد خاں کو سلام کہیے گا اور یہ خط پڑھا دیجیے گا۔

روز چہار شنبہ ۶۔اپریل ۱۸۶۸ء نجات کا طالب غالب

نواب ابراہیم علی خاں وفاؔ

ان کے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ میرزا محمد عسکری نے انھیں سورت کا رئیس بتایا ہے۔ ممکن ہے نواب میر غلام بابا خاں کا اور ان کا خاندان ایک ہو۔ یہ بڑودے میں رہتے تھے اور وہاں جاگیر بھی ملی تھی۔ میر عالم علی خاں ان کے حقیقی یا رشتے کے بھائی تھے۔ سید احمد حسن مودودی بھی ان کے ساتھ وابستہ تھے۔

(۱)

پیر و مرشد جناب سیّد ابراہیم علی خاں کو بندگی۔ غزل پہنچتی ہے۔ خط ازروے احتیاط بیرنگ بھیجا ہے۔ قبلہ! آپ کے بھائی میر عالم علی خاں صاحب مجھ پر کیوں خفا ہیں۔ کہ اپنی غزل نہیں بھیجتے؟ یہ امر ان کے خاطرنشاں ہو جائے کہ غالب آپ کے دادا کا غلام اور خدمت بجالانے کو آمادہ ہے۔

نہم ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ
(۲۱- جولائی ۱۸۶۶ء) نجات کا طالب غالبؔ

(۲)

ولی نعمت کو غالب کی بندگی،

بسبب ضعف پیری کے خدمت گزاری میں درنگ واقع ہو جائے تو معاف رہوں، قاصر کبھی نہ رہوں گا۔ انشاء اللہ العظیم۔ دو غزلوں میں سے ایک غزل بعد اصلاح پہنچتی ہے، دوسری غزل ہفتۂ آیندہ میں پہنچ جائے گی۔ ضعفِ اعضا اور دوامِ مرض سے علاوہ اختلالِ حواس کا کیا حال لکھوں۔ دو تین دن ہوے کہ قبلہ و کعبہ میر عالم علی خاں کا خط آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ آزردہ تخلص کی دو غزلیں اصلاحی پہنچیں

دیکھیے اس سہو کو کہ کس کی غزلیں کس کو پہنچیں۔ مزا اس میں ہے کہ اب یہ بھی یاد نہیں آتا کہ آزردہ کا نام کیا ہے اور وہ کون ہے اور کہاں کا ہے، شاید اس بندۂ خدا کو حضرت کی غزلیں بھیجی ہوں گی۔ خدا کرے وہ بزرگوار میر صاحب کی غزلیں میر صاحب کی طرح میرے پاس بھیج دے، تو میر صاحب کی خدمت میں بھیج دوں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اُن غزلوں کو، جو اب آئی ہیں، دیکھوں گا۔ یہ اکہتّر برس کی عمر کی خوبی ہے آپ میر صاحب قبلہ کو خط پڑھوا دیجیے گا۔

۲۰۔ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء لطف و کرم کا طالب غالبؔ

(۳)

سیّد صاحب قبلہ نواب میر ابراہیم علی خان بہادر کو غالب علی شاہ کا سلام۔ وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے:

بس شوق قتل سے ہے الخ

گم ہو گئی پھر لکھ کر بھیجیے اور قصور معاف کیجیے۔ یہ غزل جو اس غزل کے بعد بھیجی ہے، فی الحال بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔ میر صاحب قبلہ سید عالم علی خان بہادر کی دو غزلیں پہنچیں۔ مگر وہ یہ لکھتے ہیں کہ میں رجب کے مہینے میں وطن کو جاؤں گا۔ اور وہاں سے تیرے پاس آؤں گا۔ آج بحساب جنتری ۲۷ اور از روے رویت ۲۶ رجب کی ہے۔ غزلیں ان کی موجود مگر بھیج نہیں سکتا۔ آپ میری بے گناہی کے گواہ رہیں۔ قبلہ ضعف نے مضمحل کر دیا ہے حواس بجا نہیں۔ اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے تہتّرواں برس شروع ہو گیا ہے۔ غذا باعتبار آرد و برنج مفقود۔ صبح کو پان سات بادام کا شیرہ، بارہ بجے آب گوشت، شام کو چار کباب تلے ہوے، بس آگے خدا کا نام۔

ہاں حضرت، جناب حکیم احمد حسن صاحب کی تحریر سے کچھ حال ناسازی کا

اخوان و احباب سے حال معلوم ہُوا اور وہ علم باعث توزّعِ ضمیر ہے۔ متوقع ہوں کہ اس فساد کے رفع ہونے سے اور اپنی طمانیت خاطر سے فقیر کو آگہی بخشیے اور اس خط کا جواب مع رسید غزل جلد ارسال فرمائیے گا۔

پنجم دسمبر ۱۸۶۶ء رجب کی تاریخ اُوپر لکھ آیا ہوں[1]۔ اسد بے دستگاہ

(۴)

بخدمت قبلہ سیّد احمد حسن صاحب مودودی تسلیم۔ بجناب میر ابراہیم علی خاں بہادر کورنش مقبول باد۔ تصویرِ مہرِ تنویر مجھے پہنچی اور مَیں نے رسید لکھ بھیجی۔ عجب ہے کہ آپ کو اس کے پہنچنے میں تردّد ہے۔ امسال فقیر نے جو اپنی خاکساری کا خاکہ یعنی تصویر منشی میاں داد خان کی معرفت نذر کی ہے، یقین ہے وہ بھی پہنچی ہو گی۔ دونوں غزلیں بعد اصلاح کے بھیجتا ہوں۔ اپنی غزل آپ رہنے دیں اور سیّد صاحب کی غزل ان کے حوالہ کر دیں[2]

جمعہ ۱۷۔ اگست ۱۸۶۸ء نجات کا طالب غالب

(۵)

جناب تقدس انتساب سید صاحب قبلہ والا مناقب عالیشان نواب سیّد ابراہیم علی خان بہادر مدظلہ العالی۔ بعد بندگی معروض ہے حضرت سید احمد حسن خاں صاحب مدظلہ العالی کی تحریر سے معلوم ہُوا کہ آپ کے گھر مولود مسعود پیدا ہُوا ایک عبارت رنگین مرتب کر کے "اکمل الاخبار" میں مَیں نے چھپوا دی ہے اور ایک

---

[1] یعنی جنتری کے رو سے ۲۷ اور رویت کے رو سے ۲۶۔ ۱۲۸۳ھ

[2] یہ خط سید احمد حسن مودودی اور میر ابراہیم علی خاں میں مشترک ہے۔ لیکن چونکہ مودودی صاحب کو محض سلام لکھا ہے۔ باقی سارے خط میں تخاطب میر ابراہیم علی خاں سے ہے، اس لیے میں نے اسے میر صاحب کے مجموعے میں رکھا۔

رباعی اور ایک قطعہ اپنا اور ایک قطعہ سیّد صاحب ممدوح کا جو انھوں نے یہاں بھیجا تھا وہ بھی چھپوا دیا اور تین قطعے تاریخی بہاری لال منتظم اور میر فخر الدین مہتمم مطبع نے جو یہاں تاریخیں لکھی تھیں وہ چھپوا دیں چنانچہ اپنی لکھی ہوئی رباعی اور قطعہ عرض کرتا ہوں۔

رباعی:

حق داد بہ سیّد ز پئے انعامش　　فرخ پسرے کہ واجب است اکرامش
تاریخ ولادتش بود بے کم و بیش　　"ارشاد حسین خاں" کہ باشد نامش

قطعہ:

غالبؔ حالِ سنین ہجری　　معلوم کن از "خجستہ فرزند"
چوں یک صد و بست و چار ماند　　این ست شمار عمر دلبند

یہ تو ظاہر ہے کہ ۱۲۸۵ھ ہے۔ جب خجستہ فرزند کے اعداد میں سے ۱۲۸۵ لے لیے تو ایک سو چوبیس بچتے ہیں۔ اُن کو میں نے دعائے عمر مولود قرار دیا۔ حق تعالیٰ اس مولود کو تمھارے سامنے عمر طبعی کو پہنچائے

خط کی رسید کا طالب غالبؔ

حکیم سیّد احمد حسن مودودی

(۱)

حضرت قبلہ،

پہلے التماس یہ ہے کہ آپ صحیح النسب سیّد تمام امّت مرحومہ محمد علیہ السلام

۱؎ یہ خط اگست ۱۸۶۸ء کے بعد کا ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ سیّد احمد حسن مودودی کے نام کے خط مرقومہ ۱۷۔ جولائی ۱۸۶۸ء میں یہ ذکر ہے کہ میر ابراہیم علی خاں کے بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ ۱۷۔ اگست کے خط میں اس کا کوئی ذکر نہیں لہٰذا یہ واقعہ چند روز بعد کا سمجھنا چاہیے۔

کے قبلہ و کعبہ، جب آپ مجھ کو قبلہ و کعبہ لکھیں تو پھر میں آپ کو کیا لکھوں؟ خدا کے واسطے غور کیجیے کہ "قبلۂ قبلہ" اور "کعبۂ کعبہ" یہ کیا ترکیب ہے؟ چونکہ آپ نے مجھے اُستاد گردانا ہے، اس التماس کو بھی از قسم اصلاح تصور کیجیے۔ زنہار قبلہ قبلہ کبھی نہ لکھیے، یہ سوءِ ادب ہے بہ نسبت قبلہ۔ عیاذاً باللہ!

آپ کا عطوفت نامہ پہنچا۔ میرے پہلے خط کا ہدیہ پہنچنا اور اس کی دیر رسی کا سبب مجھ کو معلوم ہُوا۔ اب اس کا خیال رکھوں گا۔ یہ اب آپ کو معلوم رہے کہ آپ کے کسی خط کا جواب میرے ذمہ باقی نہیں ہے۔ دو یا تین خط کا جواب نہیں پہنچا۔ اس کو یہ سمجھیے کہ وہ خط راہ میں تلف ہُوے اور میرے پاس نہیں پہنچے:

بہار گلستان احمد حسن

یہ سجع کیا بُرا ہے:

دل حیدر و جان احمد حسن

یہ اس سے بھی بہتر ہے۔ انھیں دونوں میں سے ایک سجع مہر پر کھدوا لیجیے۔ غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔

۱۹- ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ - ۱۸- جون ۱۸۶۱ء غالب

(۲)

حضرت پیر و مرشد

غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔ غزل سہو سے لکھ گیا ہوں۔ دونوں غزلیں پہنچتی ہیں۔ جناب مولوی انصار علی صاحب سے مجھ کو تعارف اسمی ہے، ان کو میرا سلام کہیے اور کہیے کہ حضرت جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے، کورٹ میں مقدمہ پیش ہُوا، روبکاریاں ہوئیں، آخر صاحبانِ کورٹ

نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جایداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہِ ترحم نصف جایداد واگزاشت کی۔ اب نصف جایداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرایے پر معاش کا مدار ہے۔ اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے۔ کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی، تیس چالیس روپے مہینے کی آمد۔ لیکن چونکہ امام بخش کی اولاد ان کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں، لہذا فراغ بال سے نہیں گزرتی۔ ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرہ ثامنہ کے اواخر میں ہیں۔ خدا سلامت رکھے غنیمت ہیں

یکشنبہ ۱۹۔ جنوری ۱۸۶۲ء غالب

(۳)

سید صاحب قبلہ،

عنایت نامہ مع قصیدہ پہنچا۔ پس و پیش ایک رافت نامہ پیر و مرشد سید ابراہیم علی خاں صاحب بہادر اور ایک عطوفت نامہ قبلہ و کعبہ سید عالم علی خاں بہادر کا پہنچا۔ میں علی کا غلام اور اولاد علی کا خانہ زاد، لیکن بوڑھا اور ناتوان اور مسلوب الحواس اور بے سر و سامان۔ خدمت بجا لانے میں عذر کروں تو گنہ گار۔ درنگ و توقف کا مضائقہ نہیں۔ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا۔

خداوند نعمت کیا تم دلی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو، جو حضرت شیخ کا[1] کلام اور صاحبزادہ شاہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ کا حال پوچھتے ہو؟ "ایں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب

[1] شیخ کلیم اللہ جہان آبادی جو اپنے زمانے کے مشہور مشائخ میں تھے۔ دہلی میں قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان ان کا مقبرہ ہے۔

بر دو قصاب در راہ مرد"

بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہُوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی۔ کاغذ کا پُرزا، سونے کا تار، پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ ان کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر، اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔ ان کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا، کچھ تبرکات بھی تھے۔ اب جب وہ لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں؟ کیا کروں؟ کہیں سے یہ مدعا حاصل نہ ہو سکے گا۔

سیّد صاحب قبلہ کیوں تکلیف کرتے ہیں؟ اگر یہی مرضی ہے تو اتحاف و اہدا تکلّفِ محض ہے۔ فقیر بے سوال ہوں، اگر کچھ بھیج دیں گے رد نہ کروں گا۔ کم و بیش پر نظر نہ کریں، جتنے کا چاہیں نوٹ خط میں لپیٹ کر بھیج دیں۔ والسلام

روز شنبہ یکم ستمبر ۱۸۶۳ء — از اسد اللہ

(۴)

پیر و مرشد۔

تین برس عوارض احتراق خون میں ایسا مبتلا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہی۔ آپ کے خطوط آئے ہوں گے۔ کوئی عنوان ناکشودہ پڑا رہا ہوگا۔ البتہ حاجی مصطفےٰ خاں کا آنا مجھ کو یاد ہے۔ یقین کرتا ہوں کہ انھوں نے از روے مشاہدہ میری خستگی تن کا حال حضرت کو لکھا ہوگا۔ اب میں اپنی زبان سے یہ کیوں کر کہوں کہ اچھا ہوں، مگر بیمار اور عوارض میں گرفتار نہیں ہوں۔ بوڑھا، بہرا، اپاہج، بدحواس، ناتوان، فلک زدہ آدمی ہوں۔ عہد کرتا ہوں کہ جب آپ کا خط آئے گا

اُس کا جواب لکھوں گا۔ جب غزل آئے گی اس کو دیکھ کر پھر بھیجوں گا۔ مگر حضرت کے مسکن کا پتہ بھول گیا۔ یہ خط تو مصطفٰے خاں سوداگر کو بھیجے دیتا ہوں، وہ آپ کو بھجوادیں گے۔ آیندہ جو عنایت نامہ ڈاک میں آئے اس میں مسکن و مقام و شہر کا نام لکھا جائے۔

۲۴- جولائی ۱۸۶۵ء نجات کا طالب غالبؔ

(۵)

حضرت پیر و مرشد،

ان دنوں میں اگر فقیر کے عرائض نہ پہنچے ہوں یا ارشاد کے جواب ادا نہ ہُوئے ہوں تو موجب ملال خاطر اقدس نہ ہو:

اتفاق سفر افتاد بہ پیری غالبؔ   آنچہ از پائے نیامد ز عصامی آید

رام پور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار روزینہ خوار ہوں۔ رئیس حال نے مسند نشینی کا جشن کیا۔ دعا گوئے دولت کو در دولت پہ جانا واجب ہُوا۔ ہفتم اکتوبر کو دلّی سے رام پور کو روانہ ہُوا۔ بعد قطع منازل ستہ وہاں پہنچا۔ بعد اختتام بزم، عازم وطن ہُوا۔ ہشتم جنوری کو دلّی پہنچا۔ عرض راہ میں بیمار ہُوا۔ پانچ دن مراد آباد میں صاحب فراش رہا۔ اب جیسا فرسودہ رواں و ناتواں تھا، ویسا ہوں۔ جواب خطوط مجتمعہ لکھ سکتا ہوں؟

نواب میر جعفر خاں مبرور و مغفور کا خاندان، سبحان اللہ:

ایں سلسلہ از طلائے ناب است   ایں خانہ تمام آفتاب است

نواب میر غلام بابا خان میرے دوست اور میرے محسن ہیں۔ راہ و رسم نامہ و پیام مدت سے باہمدگر جاری ہے۔ آپ کا حکم بے تکلف مانوں گا۔ جناب میر ابراہیم علی خاں صاحب اور حضرت میر عالم علی خاں صاحب کی خدمت گزاری کو اپنا فخر و شرف جانوں گا۔ اس وقت بکس کھولا ہے۔ خطوط اطراف و جوانب دیکھ رہا ہوں۔ پہلے حضرت کے

خط کا جواب بطور اختصار لکھا ہے۔ اب جب اس کا جواب آئے گا، تب فقیر حکم بجالائے گا۔

چارشنبہ۔ ۱۷۔ جنوری ۱۸۶۶ء　　　　　اسد اللہ

(۶)

پیر و مرشد،

آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے؟ ضعف، نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہوگیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہو گئے۔ جہاں تک ہوسکا احباب کی خدمت بجالایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے، نہ ہات سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبرسن کے خدا تعالیٰ اُنے فرض اور پیمبر نے سُنّت معاف کردی تھی۔ مَیں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمتِ اصلاحِ اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوطِ شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہوسکے گا لکھ دیا کروں گا۔ زیادہ حد ادب۔

۸۔ اپریل ۱۸۶۶ء　　　　　راقم اسد اللہ خاں غالب

(۷)

پیر و مرشد،

یکم محرم کا خط کل ۱۸۔ محرم کو پہنچا، آج ۱۹۔ کو جواب لکھتا ہوں۔ آپ پر اور میر ابراہیم علی خاں پر میری جان نثار ہے۔ مضے ما مضے۔ اب ایک ایک غزل آپ تینوں صاحب بھیج دیا کیجیے۔ اسی طرح مَیں فرداً فرداً بعد اصلاح بھیج دیا کروں گا۔ مگر میرے قبلہ و کعبہ واسطے خدا کے شجرۂ منظومہ ارسال نہ فرمائیے گا۔ اس کی اصلاح میری حد وسع سے باہر ہے۔ میرا شیوہ نہیں ہے خط بیرنگ بھیجنا۔ یہ خط عمداً

بیرنگ بھیجتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ پیڈ کے تلف ہونے کا احتمال ہے اور بیرنگ کا نہیں
شنبہ دوم جون ۱۸۶۶ء اسد اللہ

(۸)

قبلہ،

ڈاک کے ہرکارے نے کل دو خط ایک بار پہنچائے، ایک آپ کا خط مع غزل اور ایک نواب میر ابراہیم علی خاں کا خط مع غزل۔ آج تین باتیں ضروری لکھنی تھیں، اس واسطے یہ خط آج روانہ کرتا ہوں۔ ایک بات یہ کہ غزل کا کاغذ واپس بھیجتا ہوں، نہ اس کو پھاڑ سکوں، نہ پانی میں دھو سکوں، شہیدی کی غزل ان قافیوں میں بہ تغیّر ردیف ایسی ہے کہ اب ان قافیوں کا باندھنا ہرگز نہ چاہیے۔ آپ اور غزل لکھیے اس کو ہرگز دیوان میں نہ رکھیے۔

یہ بھی اس ضمن میں لکھنا مناسب ہے کہ میر ابراہیم علی خاں صاحب نے اپنی اصلاحی غزل کی رسید کل کے خط میں لکھ بھیجی۔ آپ اپنے خط میں کس راہ سے لکھتے ہیں کہ وہ غزل اصلاحی مانگتے ہیں؟ اسی فصل میں یہ بھی اطلاع دیتا ہوں کہ آپ کی یہ غزل "سلا کر سوئے" اور "نہلا کر سوئے" اور تاریخ ہائے بنائے مسجد دیکھ کر اور اصلاح دے کر آج پانچواں دن ہے کہ ڈاک میں بھیج چکا ہوں اور دوسری یہ بات ہے کہ آپ سیّد صاحب کا حال مفصل لکھیے۔ ایسا کَے لاکھ کا ملک بڑودہ کی سرکار سے ہمارے محسن کو ملا ہے کہ ان سے دو لاکھ روپیہ نذرانہ مانگا جاتا ہے۔ آگے اس راج میں حسام الدین حسین خاں بڑے معزز اور مکرم متوسل تھے اور سیر حاصل جاگیریں رکھتے تھے، سید ابراہیم علی خاں صاحب اسی خاندان میں سے ہیں؟ اور ہاں یہ بھی لکھیے کہ میر عالم علی خاں کو ان سے اور آپ کو ان دونوں صاحبوں سے کیا قرابت ہے؟ تیسری بات یہ ہے کہ جب نوٹ بھیجیے تو اہلِ کلکتہ کی طرح آدھا آدھا

دو بار کر کے نہ بھیجے گا۔ میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے، ورنہ دلی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو۔

۲۵۔ ستمبر ۱۸۶۶ء اسداللہ

(۹)

حضرت

یہ آپ کے جد امجد کا غلام تو مر لیا۔ کثرت احکام، تواتر ورود اشعار، پھر یہ ہنجار کہ سو روپے کے نوٹ کی رسید سو بار مانگتے ہو۔ میر ابراہیم علی خاں صاحب کی غزل، جس کا ایک شعر یہ ہے:

علی علی جو کہا تا سحر تو یوں سمجھے کہ ذوالفقار سے کٹتی ہے اب ہماری رات

بعد اصلاح بھیج چکا ہوں اور آپ اس کا تقاضا کیے جاتے ہیں۔ غزلیں آپ کی برستی ہیں، کہاں تک دیکھوں؟ آپ کی غزلوں کے ساتھ اور غزلیں بھی گم ہو جاتی ہیں۔ بہتر برس کا آدمی، پھر رنجور دائمی، غذا یکقلم مفقود۔ آٹھ پہر میں ایک بار آب گوشت پی لیتا ہوں، نہ روٹی، نہ بوٹی، نہ پلاؤ، نہ خشکا۔ آنکھ کی بینائی میں فرق، ہاتھ کی گیرائی میں فرق۔ رعشہ مستولی، حافظہ معدوم۔ جہاں جو کاغذ رہا، وہ وہیں رہا۔

میر عالم علی خاں صاحب کی دو غزلیں آئی ہوئی کہیں رکھ کے بھول گیا ہوں، خلاصہ یہ کہ نوٹ عطیہ سید صاحب کا آپ کے خط میں پہنچا۔ روپیہ وصول ہوا، معاً خرچ ہوا ان کی ایک غزل "ساری رات" "ہماری رات" جس کا ایک شعر اوپر لکھ آیا ہوں بعد اصلاح بھیج چکا ہوں اور کوئی غزل ان کی اب میرے پاس نہیں اور جناب میر عالم علی خاں کی دو غزلیں یاد ہیں کہ آئی ہیں، اگر مل جائیں گی تو بعد اصلاح بھیجوں گا۔ آپ کی غزلیں شمار سے باہر ہیں۔ بکس میں دیکھوں گا کتابوں میں ڈھونڈوں گا۔

مدعا یہ کہ آپ اور دونوں سید صاحب اس کا التزام کریں کہ ایک غزل اپنے خط میں بھیجیں۔ جب وہ غزل اور اس خط کا جواب پہنچ جائے، تب دوسری غزل خط میں ملفوف ہو کر بھیجی جائے، اور خط ہر صاحب کا جُدا ہو۔ آپ یہ میرا خط غور سے پڑھ لیں اور دونوں سیّد صاحبوں کو پڑھوا دیں۔ از روے احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں۔

۱۸۔ اکتوبر ۱۸۶۶ء　　　　اسد بیک رنگ

(۱۰)

سید صاحب و قبلہ حکیم سیّد احمد حسن صاحب کو غالب نیم جان کا سلام پہنچے۔ وہ جو آپ نے سُنا ہے کہ اب غالب کو مرض سے افاقت ہے، سو محض غلط ہے۔ آگے ناتواں تھا، اب نیم جان ہوں۔ خط نہیں لکھ سکتا۔ ایک لڑکے سے یہ چند سطریں لکھوا دی ہیں۔ جو میں کہتا گیا ہوں، وہ غریب لکھتا گیا ہے۔ آپ سیّد ہیں اور بزرگ ہیں، میرے حق میں دُعا کریں کہ اب تہتّر برس سے آگے نہ بڑھوں اور اگر کچھ زندگی اور ہے تو حق تعالیٰ تھوڑی سی صحت اور طاقت عنایت کرے تاکہ دوستوں کی خدمت بجا لاتا رہوں۔

۳۔ جولائی ۱۸۶۷ء　　　　غالب

(۱۱)

جناب سیّد صاحب و قبلہ سید احمد حسن صاحب کو غالب نیم جان کی بندگی۔ قبول ہو اور یہ عرض بھی قبول ہو کہ جناب معلّی القاب نواب ابراہیم علی خاں بہادر کی خدمت میں میری بندگی عرض کریں۔ بارے بصورت تصویر دونوں صاحبوں کی خدمت میں میرا اسلام پہنچنا معلوم ہوا۔ اگرچہ اس صورت میں چلنا پھرنا خدمت بجا لانی نہیں ہو سکتی، مگر خیر حضرت کے پیش نظر حاضر رہوں گا، عنایت کی نظر

رہے میرے حال پر۔ یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ نواب صاحب قبلہ کے ہاں اس مہینے میں لڑکا پیدا ہونے والا ہے، مجھ کو تاریخ تولد کا خیال رہے گا جب آپ کی تحریر سے نوید تولد معلوم کر لوں گا، تب قطعہ یا رباعی جو کچھ ہو گئی ہو گی، وہ بھیج دوں گا اور یہ جو آپ نے اپنی اور نواب صاحب کی غزلوں کی اصلاح کے واسطے لکھا ہے، مجھے اس حکم کی تعمیل بدل منظور ہے۔ جس مہینے تک میں زندہ ہوں اس مہینے تک خدمت بجا لاؤں گا۔

۱۷۔ جولائی ۱۸۶۸ء

تفضل حسین خاں

(۱)

کیوں صاحب،

یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و اُستادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے۔ میرا کلام، خرید آٹھ دس روپے کی، سو وہ بھی میں نہیں کہتا کہ مجھ کو دے ڈالو۔ تم کو مبارک رہے۔ مجھ کو مستعار دو۔ میں اس کو دیکھ لوں، پھر تم کو واپس بھیج دوں۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا، دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو۔ میرا اعتبار نہیں یا یہ کہ مجھ کو آزار دینا اور ستانا بدل مطلوب ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دے دو۔ باللہ واللہ اس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے، نقل کر کے تم کو بھیج دوں گا۔ اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو، اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو، تو تم کو آفرین۔

غالب

سیاح

میاں داد خاں نام، سیاحؔ تخلص، "سیف الحق" لقب جو غالبؔ نے عطا کیا تھا۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد منشی عبداللہ خاں اورنگ آباد کے ذی مقدرت رئیس تھے۔ سیاحؔ کی پیدائش کے وقت دولت و اقبال کی فراوانی تھی، لیکن وہ سن شعور کو پہنچے تو گردش روزگار سے سارا نقشہ بگڑ گیا۔ ثروت و فراغت بال کی جگہ نکبت و احتیاج نے لے لی۔ مجبور ہو کر وہ گھر سے نکل پڑے اور بمبئی ہوتے ہوئے سورت پہنچے، جہاں نواب میر غلام بابا خاں نے انھیں مصاحبت میں داخل کر لیا۔ پھر وہ بہ قصدِ سیاحت نکلے تو دہلی، کان پور، لکھنؤ، بنارس اور کلکتہ وغیرہ ہوتے ہوئے پھر سورت لوٹے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایران و عرب و مصر کی سیاحت بھی کی تھی، اسی وجہ سے غالبؔ نے ان کے لیے سیاحؔ کا خطاب تجویز کیا تھا۔

"قاطع برہان" کی اشاعت پر ردّ و بحث کا جو ہنگامہ برپا ہوا تھا اس سلسلے کی ایک کتاب سیاحؔ سے بھی منسوب ہے۔ یعنی "لطائف غیبی" لیکن اہل علم و ذوق کی رائے یہ ہے کہ یہ کتاب خود غالب کی مولفہ تھی اگرچہ سیاحؔ کے نام سے چھپی، اس لیے کہ انداز تحریر و نگارش صاف غالب کا ہے۔ سیاحؔ کا جو انداز "سیر سیاح" میں ہے، وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یا کم از کم یہ ظاہر ہے کہ غالبؔ نے کتاب کی عبارت میں اتنا تصرف کیا کہ اسے بے تکلف غالب کی تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ سیاحؔ کو لطائف کا جو نسخہ میرزا نے بھیجا تھا اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ نسخہ میں نے اپنے مطالعہ میں رکھ کر درست کر دیا ہے، باقی نسخوں کو بھی

اس کے مطابق صحیح کرلو۔

میرزا محمد عسکری صاحب نے لکھا ہے کہ ۱۸۶۵ء میں سیاح کے خلاف قلب سازی کا مقدمہ قائم ہوا، جس میں وہ سزا پا گئے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ ستر برس کی عمر پاکر ۱۹۰۷ء میں بمبئی میں فوت ہوئے۔

(۱)

برخوردار کامگار، سعادت نشان منشی میاں داد خاں سیاح طال عمرہٗ۔

درویش گوشہ نشیں غالبِ حزیں کی دعائے درویشانہ سے کامیاب و بہرہ مند ہوں۔ لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے مگر تم کو یاد رہے کہ وہاں بعد اس فساد کے ایک کون[1] ہوگا، یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے۔ جو دیکھے گا وہ داد دے گا اور دلی کے فساد کے بعد کون نہیں ہے۔ یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت سوائے اس بازار کے، جو قلعے کے لاہوری دروازہ سے شہر کے لاہوری دروازہ تک ہے[2]، سراسر بگڑ گئی اور بگڑتی جاتی ہے۔

دیوان کا چھاپا کیسا؟ وہ شخص ناآشنا، موسوم بہ عظیم الدین[3]، جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا، آدمی نہیں، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے، قصہ مختصر سخت نامعقول ہے۔ مجھ کو اس کے طور پر انطباع دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہاتھ آجائے۔ تم بھی دعا مانگو۔ زیادہ کیا لکھوں[4]؟

دوشنبہ ۱۱۔ جون ۱۸۶۰ء　　　　غالب

---

[1] یعنی بگاڑ کے بعد بناؤ کی صورت نکلے گی۔ [2] یعنی چاندنی چوک اور کھاری باولی

[3] عظیم الدین میرٹھی جسے دیوان چھاپنے کے لیے دیا تھا۔ پھر اس سے واپس مانگ لیا تھا کہ منشی شیو نرائن آرام نے کہا تھا کہ دیوان میں چھاپوں گا۔

[4] اس خط سے ظاہر ہے کہ یہ غالب کی طرف سے سیاح کے نام کا پہلا خط نہیں ہو سکتا۔ اور خط بھی لکھے ہوں گے، جو ضائع ہو گئے۔

(۲)

برخوردار،

تمھارا خط پہنچا۔ لکھنؤ کا کیا کہنا! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی۔ جو بے سروپا وہاں پہنچا، امیر بن گیا۔ اس باغ کی یہ فصل خزاں!

مَیں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اُردو کا دیوان غاصبِ ناانصاف سے ہاتھ آگیا اور میں نے نورِ چشم منشی شیو نرائن کو بھیج دیا۔ یقین کلی ہے کہ وہ چھاپیں گے۔ جہاں تم ہوگے، ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا۔ طریقۂ سعادت مندی یہ ہے کہ ہم کو اپنی خیر و عافیت کا طالب جان کر جہاں جاؤ، وہاں سے خط لکھتے رہو اور اپنے مسکن کا پتہ ہم پر ظاہر کرتے رہو۔ ہم تم سے راضی ہیں اور چونکہ تمھاری خدمت اچھی طرح نہیں کی، شرمندہ بھی ہیں۔

مرقومہ شنبہ روزِ عید مطابق ۳۰۔ جون ۱۸۶۰ء راقم اسداللہ خاں

(۳)

بھائی،

تمھاری جان کی اور اپنے ایمان کی قسم کہ فنِ تاریخ گوئی و معمّا سے بیگانۂ محض ہوں۔ اُردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سُنی ہوگی۔ فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ مادہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ مَیں کیا کہتا ہوں؟ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا، حساب درست نہ پاؤں گا۔ دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادۂ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈ لا دیتے، موزوں مَیں کرتا۔ اور اگر آپ مادے کی فکر کی ہے اور یہی حساب جمل منظور رکھا ہے تو ایسے تعمیے اور تخرجے آ گئے ہیں کہ وہ تاریخ ہنسی کے قابل ہو گئی ہے۔ کلکتہ میں قاضی القضاۃ سراج الدین علی خاں مرحوم

کی قبر پر مسجد بنی ہے۔ ان کے بھتیجے مولوی ولایت حسین خاں نے استدعائے تاریخ کی۔ مَیں نے لکھی۔ چنانچہ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے :

مفتی عقل از پئے تاریخ ایں بنا — ایما بسوے من ز رہِ احترام کرد
گفتم بہ وے بدیہہ "خوشا خانۂ خدا" — شد خشمگیں دمے کہ نظر در کلام کرد
خاشاک رُفت و پاے ادب در شکنجہ ریخت — ایہام را بہ تخرجہ معنی تمام کرد

واسطے خدا کے غور کرو "خوشا خانۂ خدا" مادّہ، پھر اس میں سے "خاشاک" کے عدد دُور کرو، نوسو اکیس کا تخرجہ پھر بھی دو اور زیادہ رہے۔ "پاے ادب" (یعنی "ب") کو ڑا۔ بھلا یہ کوئی تاریخ ہے ؟ مگر ہاں حساب کے قاعدے سے باہر کچھ معنی سگالی کے طور پر میرا ایجاد ہے اور وہ لطف رکھتا ہے۔ ایک شخص ۱۲۴۸ھ میں مرا۔ اس کی تاریخ میں نے لکھی :

ز سال واقعۂ میرزا مسیتا بیگ — ملت راست شمارِ ائمہ امجاد
صحیفہ ہاے سماوی مبیّن از عشرات — حدیقہ ہاے بہشتی مشخّص از آحاد

ائمہ بارہ یعنی "بارہ سو"، پھر کتب سماوی "چار"، دہا کے چار یعنی چالیس، بہشت آٹھ، چالیس اور آٹھ اڑتالیس۔ بارہ سو اڑتالیس۔

دوسری تاریخ بارہ سو ستر کی :

از بروج سپہر جوئی مآت — عشرات از کواکب سیّار

برج بارہ، سات دہا کے ستّر۔

یہ جو لکھتے ہو کہ سیّد غلام بابا کسی بحر میں نہیں آتا، کیوں نہیں آتا ؟

جب کہ سیّد غلام بابا نے — مسندِ عیش پر جگہ پائی
ایسی رونق ہوئی برات کی رات — کہ کواکب ہوئے تماشائی

دوسری بحر سنو :

ہزار شکر کہ سیّد غلام بابا نے | فرازِ مسندِ عیش و طرب جگہ پائی
زمیں پہ ایسا تماشا ہُوا برات کی رات | کہ آسماں پہ کواکب بنے تماشائی

اس بحر میں سماتا ہُوا کوئی مادہ بہم پہنچاؤ، تاریخ کہہ لو۔ وہ دوست جو مادہ ڈھونڈ دیتے تھے، وہ جنّت کو سدھارے۔ جیساکہ اُوپر لکھ آیا ہوں معذور اور مجبور ہوں۔

سہ شنبہ ۱۱۔محرم۔ ۳۱ جولائی سال حال۔
(سنہ ۱۲۷۷ھ و سنہ ۱۸۶۰ء) غالبؔ

(۴)

سعادت و اقبال نشان منشی میاں داد خاں سے۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ ان کے خطوط کا جواب نہیں لکھا غزلوں کے مسودے گم ہو گئے۔ اس شرمندگی سے پاسخ نگار نہ ہُوا۔ اب یہ سطریں جو لکھتا ہوں، اس خط کے جواب میں ہیں جو بنارس سے آیا ہے۔

بھائی، بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے۔ ایک مثنوی مَیں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور "چراغ دیر"[۱] اس کا نام رکھا ہے۔ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔ اس کو دیکھنا۔ اشرف حسین خان صاحب میرے دوست ہیں۔ فتنۂ فساد[۲] کے زمانے سے بہت پہلے ان کا خط اور کچھ ان کا کلام میرے پاس آیا ہے تم ان کو میرا سلام کہنا اور مَیں تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک کے سفر کی سرگزشت لکھی ہے اسی طرح آیندہ بھی لکھتے رہو گے۔ میں سیر و سیاحت

۱؎ یہ مثنوی غالب کے کلیات نظم فارسی میں موجود ہے اور بہ اعتبار ترتیب مثنویوں میں تیسری ہے کل ایک سو آٹھ شعر ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے:

نفس با صور دمساز است امروز | خموشی محشر راز است امروز

۲؎ یعنی "غدر"

کو بہت دوست رکھتا ہوں:

اگر بہ دل نہ خلد ہر چہ در نظر گذرد   زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد

خیر اگر سیر و سیاحت میسّر نہیں، نہ سہی، "ذکر العیش نصف العیش" پر قناعت کی۔
میاں داد خاں سیّاح کی سرگزشت سیر و سفر ہی سہی۔

غزل تمھاری رہنے دیتا ہوں۔ اس کے دیکھنے کی ابھی فرصت نہیں ہے۔ جیسا تم نے وعدہ کیا ہے، جب اور غزلیں بھیجو گے، ان کے ساتھ اس کو بھی دیکھ لوں گا، بلکہ احتیاط مقتضی اس کی ہے کہ ان غزلوں کے ساتھ اس کو بھی لکھ بھیجنا۔

ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکمّا کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی، گرانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز در پیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اگر بازپرس ہوئی تو سقر مقر[1] ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے   مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے[2]

اللہ، اللہ، اللہ!

صبح دوشنبہ ۳۱۔ دسمبر سنہ ۱۸۶ء   نجات کا طالب غالب

(۵)

منشی صاحب،

تمھارے خط پہنچنے کی تم کو اطلاع دیتا ہوں اور مطالب مستفسرہ کا جواب لکھتا ہوں اور اپنے دوست روحانی مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کو سلام کہتا ہوں۔ کہہ دیجیے گا

---

[1] جائے قرار، ٹھکانا۔
[2] یہ شعر ذوق کا ہے۔

بلکہ یہ رقعہ دکھا دیجیے گا ۱۲

بعض لوگ "آن بان" بولتے ہیں، مگر فقیر کے نزدیک "آن تان" صحیح ہے اور یہی فصیح ہے ۱۲

"پر" بمعنی "لیکن" لفظ مشہور ہے اور "پہ" اس کا مخفف ہے اس میں شاید کسی کو کلام نہ ہو۔ کوئی اور لکھے یا نہ لکھے، میرے اُردو کے دیوان میں سو دو سو جگہ یہ لفظ آیا ہوگا ۱۲

مجھ کو بنگالے سے آئے ۳۲-۳۳ برس ہوئے۔ بہت احباب مر گئے۔ بہت متفرق ہو گئے۔ اب ایسا وہاں کوئی نہیں جس سے ارسال رسائل کی رسم و راہ ہو۔ ۱۲

صاحب، وہ شعر جس کو تم نے پوچھا یہ ہے:

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو   کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

دو شعر اس غزل کے اور یاد آ گئے ہیں، وہ دوسرے صفحہ پر لکھتا ہوں:

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب   آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں   کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

دیکھو یہ "پر" کا مخفف "پہ" ہے، بمعنی لیکن ۱۲

بنارس کا کیا کہنا ہے۔ ایسا شہر کہاں پیدا ہوتا ہے۔ انتہائے جوانی میں میرا وہاں جانا ہوا۔ اگر اس موسم میں جوان ہوتا تو وہیں رہ جاتا اور ادھر کو نہ آتا:

عبادت خانۂ ناقوسیان است   ہمانا کعبۂ ہندوستان است

جس بحر میں کوئی اسم یا کوئی لفظ نہ آ سکے، اس کی تدبیر فردوسی و خاقانی سے بھی نہ ہوگی، میں کیا کروں گا؛ نام تمھارا آ سکتا ہے، لیکن الف دبتا رہتا ہے۔ خدا کے واسطے اس کی تدبیر سرور صاحب سے بھی ضرور پوچھنا۔

سہ شنبہ ۱۲۔ فروری سال ۱۸۶۱ء   نجات کا طالب غالب

(۶)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، سیف الحق میاں داد خان سیّاح کو دُعا۔ صاحب، وہم اور چیز ہے اور احتیاط اور چیز ہے۔ کارپردازان ڈاک میرے خطوط کے ٹکٹ کبھی نہ دبائیں گے اور میرے خطوط کبھی نہ تلف ہوں گے۔ آدھ آنے کی جگہ دوست کا ایک آنہ کیوں کھوؤں؟

"گلشن" بعض کے نزدیک مؤنث اور بعض کے نزدیک مذکر ہے۔ "قلم"، "دہی"، "خلعت" ان کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی مؤنث، کوئی مذکر بولتا ہے۔ میرے نزدیک "دہی" اور "خلعت" مذکر ہے اور قلم مشترک۔ چاہو مذکر کہو، چاہو مؤنث۔ "گلشن" البتہ مذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بھائی جہاں الف دبتا ہے، میرے کلیجے میں ایک تیر لگتا ہے۔ "رکھتا ہے گلشن بھی" یہ الف دبتا ہُوا دیکھ کر میں نے رکھتی ہے، بنا دیا۔ مگر "گلشن" مذکر مناسب ہے۔ "پھلکی" یا "پھلکا" تنہا بے معنی محض ہے۔ "ہلکی پھلکی" یا "ہلکا پھلکا" یوں آئے تو درست، ورنہ لغو۔ اور یہ جو "پھلکا" پتلی چپاتی کو کہتے ہیں، یہ دوسرا لُغت ہے۔ "پھلکے"، کبھی کوئی نہ بولے گا۔ "پانی وانی" "حُقّہ وُقّہ" یوں کہیں گے۔ نرا "وانی" اور نرا "وقہ" نہ کہیں گے۔ "ہلکا پھلکا" "ہلکی پھلکی" کہیں گے سبک چیز کو۔ نرا "پھلکا" یا نری "پھلکی" نہ کہیں گے۔ تذکیر و تانیث کے باب میں مرزا رجب علی بیگ سے مشورہ لیا کرو اور دبتے ہُوئے حروف بھی اُن سے پوچھ لیا کرو۔[1] ۱۲

غالب

---

[1] اس خط پر تاریخ درج نہیں۔ لیکن اس کے آخر میں ہے کہ تذکیر و تانیث کے متعلق سرور سے مشورہ لے لیا کرو۔ سیاح نے سمجھا کہ یہ سرور کی شاگردی کا مشورہ ہے۔ چنانچہ غالب کو لکھ دیا۔ میرزا نے خط ۸ میں اس غلط فہمی کی تردید کی۔ لہذا میں نے اسے خط ۶ رکھا۔ یہ ۱۸۶۱ء کے اوائل . . . . . . ہونا چاہیے۔ اس وقت سرور بنارس میں راجا کے پاس ملازم تھے۔

(۷)

بھائی،

ہم نے تم کو یہ نہیں کہا کہ تم مرزا رجب علی بیگ[۱] کے شاگرد ہو جاؤ اور اپنا کلام ان کو دکھاؤ۔ ہم نے یہ کہا ہے کہ تذکیر و تانیث کو اُن سے پوچھ لیا کرو۔ دکھن بنگالے کے رہنے والوں کو اس امر خاص میں دلی لکھنؤ کے رہنے والوں کا تتبع ضرور ہے ۱۲۔

ایک قاعدہ تم کو معلوم رہے عین کا حرف فارسی میں نہیں آتا۔ جس لغت میں عین ہو اس کو سمجھنا کہ عربی ہے۔ بعد معلوم ہونے اس قاعدے کے یہ سمجھو یہ "غربال" (غین نقطہ دار مکسور اور رائے قرشت اور بائے موحدہ اور الف و لام) یہ لغت فارسی ہے۔ ہندی اس کی چھلنی اور مرادف اس کی "پرویزن" (یعنی فارسی میں چھلنی کو "غربال" اور "پرویزن" کہتے ہیں) اور چھلنی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو کوئی نہ جانے۔ رہا عربال عین سعفص اور یائے تحتانی سے فصیح کیا بلکہ غلط محض و محض غلط ہے۔ ہاں اگر عربی میں چھلنی کو عریال کہتے ہوں تو فارسی غربال اور عربی عریال۔ مگر میں ایسا گمان کرتا ہوں کہ غربال کا عربی میں کچھ اور اسم ہوگا، عریال نہ کہتے ہوں گے۔

اب تم سنو فن لغت میں ایک امر ہے کہ اس کو تصحیف کہتے ہیں یعنی لفظ کی صورت ایک ہو اور نقطوں میں فرق، جیسا کہ سعدی "بوستاں" میں کہتا ہے:

مرا بوسہ گفتا بہ تصحیف دہ   کہ درویش را توشہ از بوسہ بہ

"توشہ" و "بوسہ" و "نوشہ"، یہ تین لفظ مصحّف ہمدگر ہیں۔ حال آنکہ معانی میں وہ فرق کہ جیسا زمین و آسمان میں۔ "توشہ"، ترجمہ زاد کا؛ "بوسہ" ترجمہ قُبلہ کا،

---

[۱] رجب علی بیگ سرور مصنف "فسانہ عجائب" وغیرہ

" نوشہ "، اسم " دولہ " کا۔ صاحبان فرہنگ میں " برہان قاطع " والا تصحیف میں بہت مبتلا ہے۔ گزر اور گزر خرپزہ اور خربزہ۔ کہتا ہے کہ " سدا " بہ سین سعفص لفظ فارسی ہے، بمعنی آواز اور " صدا " بہ صاد تعریب ہے۔ جو لغات " تے " میں لکھے ہیں، انھیں لغات کو " طوے " میں لکھتا ہے۔ حال آنکہ جس طرح عین فارسی میں نہیں ہے، طوے بھی نہیں ہے۔ مثلاً تشت لغت فارسی الاصل ہے۔ املا اس کی طوے سے غلط ہے؎۱ " برہان قاطع " والا اس کو " تے " سے بھی لایا ہے اور طوے سے بھی۔ محققین جانتے ہیں کہ " صدا " بمعنی آواز لغت عربی الاصل ہے، نہ معرب اور " سدا " سین سے ہرگز فارسی میں آواز کو نہیں کہتے۔ ہاں اُردو کے محاورے میں بمعنی " ہمیشہ " کے مستعمل ہے، قصّہ کوتاہ غربال بمعنی چھلنی کے لفظ فارسی الاصل صحیح اور فصیح ہے۔ اور غربال اگر کسی اور فرہنگ عربی میں مثل " قاموس " اور " صراح " وغیرہ کے بمعنی چھلنی کے نکلے تو اس کو مانو ورنہ یہ " برہان قاطع " والے کے خرافات میں سے ہے۔

۲۷۔ فروری سنہ ۱۸۶۱ء نجات کا طالب غالب

(۸)

صاحب،

کل آپ کا خط آیا، میرا دھیان لگا ہُوا تھا کہ آیا میاں سیّاح کہاں ہیں اور مجھ کو کیوں بھول گئے۔ پہلا خط تمھارا جس کا حوالہ اس خط میں دیتے ہو، میں نے نہیں پایا، ورنہ کیا امکان تھا کہ جواب نہ لکھتا۔ جناب منشی میر امیر علی صاحب سے مجھ سے ملاقات نہیں، لیکن ان کے محامد و مکارم سُنتا ہوں۔ جناب مولوی اظہار حسین صاحب سے البتہ اسی شہر میں دو ملاقاتیں ہوئی ہیں، لیکن میں نے ان کو فقیر دوست اور درویش نواز

؎۱ یعنی اسے طشت لکھنا غلط ہے " تشت " لکھنا چاہیے۔

نہ پایا۔ اغنیا کے واسطے اچھے ہیں۔ ہائے مولوی محمد حسن اور مولوی عبدالکریم! اس عہد میں اگر ان بزرگوں میں سے ایک ہوتا تو میں کیوں اپنی قسمت کو روتا۔ وقت گزر جاتا ہے، بات رہ جاتی ہے۔

ہاں، خاں صاحب، آپ جو کلکتے پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق[1] کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرے[2] میں اس کا کیا حال ہے؟ گزارا کس طرح ہوتا ہے؟

جمعہ ۴ ماہ اکتوبر سنہ ۱۸۶۱ء غالب

(۹)

صاحب،

آج تمھارے کئی خطوں کا جواب لکھتا ہوں۔ مولوی کرامت علی صاحب میرے شفیق ہیں۔ جس زمانہ میں وہ دلّی آئے تھے، میری اُن سے ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ وہ میرے دوست ہیں، شاگرد نہیں اور ہرگز قصیدہ اُنھوں نے میری مدح میں نہیں لکھا۔ آغا عبدالرزاق شیرازی نے گویا میری خستگی اور تہمت زدگی کا انتقام لیا۔ بہرحال میں تمھارا احسانمند ہوں۔ اگر تم وہاں نہ ہوتے تو میری اور میر منشی کی صفائی نہ ہوتی۔ ان دنوں ضعف دماغ و دوران سر میں ایسا مبتلا ہوں کہ والی رام پور کا بھی بہت سا کلام یوں ہی دھرا ہے۔ دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ تمھاری بھیجی ہوئی غزلیں سب محفوظ دھری ہوئی ہیں۔ خاطر جمع رکھو۔ جب نواب صاحب کی غزلیں

---

[1] مولانا فضل حق خیرآبادی جو آخری دور میں ادب اور معقول کے امام مانے جاتے تھے۔ "غدر" میں بہ جرم اعانت باغیاں انگریزوں نے ان پر مقدمہ چلایا اور حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا دی۔ انھوں نے انڈیمان میں ۱۸۶۲ء میں وفات پائی۔

[2] انڈیمان۔

دیکھوں گا تو یہ بھی دیکھی جائیں گی۔

جب حال یہ ہو کہ اصلاح نہ دے سکوں تو فکر تاریخ کیا کروں؟ اگر میرا حال درست ہوتا تو جناب مولوی عبدالغفور خاں صاحب نسّاخ کے دیوان کی تاریخ ضرور لکھتا اور اس خدمت گزاری کو اپنی سعادت سمجھتا۔ آپ جناب مولوی صاحب سے میرا سلام کہیں اور یہ میرا رقعہ ان کو دکھا دیں۔

چہارشنبہ ۲۰۔ نومبر ۱۸۶۱ء　　　　نجات کا طالب غالبؔ

(۱۰)

جناب منشی صاحب،

آپ کا خط مُہری لفٹنٹ گورنر آگرہ، کہ وہ میرا بھیجا ہُوا تھا، پہنچا۔ اس کے بھیجنے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ جب گورمنٹ اعلیٰ نے مجھ کو خط لکھنا موقوف کیا تو لفٹنٹ گورنروں کے اگلے زمانے کے خطوط سے میرا کیا دل خوش ہوگا۔ ایسے ایسے پچاس ساٹھ خط میرے پاس موجود ہیں۔ مجھ کو تو چھ آنے کے پیسوں کا افسوس ہے، جو تم نے بابت محصول دیئے۔

مرقوم ۱۰۔ فروری ۱۸۶۲ء　　　　راقم اسداللہ

(۱۱)

آئیے بیٹھئے مولانا سیّاح سلام علیکم۔ مزاج مبارک۔ سورت کا پہنچنا بہر صورت مبارک ہو۔ بھائی میرا دل بہت خوش ہُوا کہ تم اپنے وطن پہنچے، لیکن تم کو چین کہاں؟ خُدا جانے کَے ہفتے یا کَے مہینے ٹھہروگے اور پھر سیاحت کو نکلوگے۔ جی میں کہوگے آؤ اب دکن کی سیر کریں۔ حیدرآباد، اورنگ آباد دونوں شہر اچھے ہیں، ان کو دیکھیں میرزا معین الدین حسین خان اور میرزا محمد حسین خان یہ دونوں بیٹے ہیں نواب قدرت اللہ بیگ خان کے اور قدرت اللہ بیگ خان ابن عم تھے نواب خدابخش خان

کے اور معین الدین حسین خان کی بہن منسوب ہے بھائی ضیا الدین خان سے۔
یہاں کوئی امر نیا نہیں واقع ہُوا۔ وہی حالات و اطوار ہیں، جو دیکھ گئے ہو مسجد جامع کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں، یہاں سے ان کے جواب گئے ہیں۔ یقین ہے کہ واگزار کا حکم آئے اور مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بدستور پہرا بیٹھا ہُوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔ والسّلام مع الاکرام۔

صبح شنبہ ۲۔ ذیقعدہ و مئی ۱۸۶۲ء غالبؔ

(۱۲)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان،

شکوہ تمھارا میرے سر آنکھوں پر، مگر کوئی خط تمھارا جواب طلب نہ تھا۔ اشعار کی اصلاح سے میں نے ہاتھ اُٹھایا۔ کیا کروں؟ ایک برس سے عوارض فساد خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہوگیا ہے۔ طاقت نے جواب دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ کھانا کھاتے وقت پلنگ پر سے اُتر بیٹھتا ہوں۔ کھانا کھا کر ہاتھ دھو کر پھر پڑ رہتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے۔ اتر کر پیشاب کیا جاتا ہے۔ بیت الخلا جانا ایک مصیبت ہے۔ تشت چوکی سہی، مگر کئی قدم جانا، پھر آنا کیا ایسا آسان ہے۔ ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی، اب نجات چاہتا ہوں۔ بہت جیا، کہاں تک جیوں گا۔ (اب تم دوسرے صفحہ کو پڑھو) جناب نواب سیّد غلام بابا خاں صاحب کی خدمت میں سلام کہنا اور ولادت فرزند کی مبارک باد دینا اور یہ قطعہ تاریخ نذر کرنا:

میر بابا یافت فرزندے کہ ماہ چاردہ ۔۔۔ بر فراز لوح گردوں گردۂ تمثال اوست
فرخی بینی و یابی بہرہ از ناز و طرب ۔۔۔ از سر ناز و طرب[۱] فرزند فرخ فال[۲] اوست

---

[۱] یعنی ۲۔ ذیقعدہ ۱۲۷۸ھ و ۲ مئی ۱۸۶۲ء

سنہ ۱۲۸۰ھ۔ "ناز" کے نون کے "پچاس" اور "طرب" کی طوے کے "نو" "فرزند فرخ فال" پر بڑھانے ہوں گے۔

پنجشنبہ ۱۶۔ اگست سنہ ۱۸۶۳ء غالب

(۱۳)

صاحب،

یہ سر پیٹنے کی جگہ ہے کہ تمھارا کوئی خط ڈاک میں ضائع نہیں ہوتا اور میرا کوئی خط تم کو نہیں پہنچتا۔ سنو، چھوٹے صاحب[۱] کا خط آیا۔ اس میں قطعہ کا شکریہ اور اجزاے کتاب کے بھیجنے کی تاکید تھی۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ اس کتاب کا چھاپا یہاں ہی شروع ہو گیا، انشا اللہ تعالیٰ بعد انطباع ایک مجلد آپ کے واسطے اور ایک منشی میاں داد خاں کے واسطے بسبیل ڈاک پارسل بھیجوں گا۔ اب تم نواب صاحب سے میرا سلام کہو اور یہ اپنے نام کا خط ان کو پڑھا دو اور ایک پتہ تم کو دیتا ہوں۔ نواب صاحب کا جو خط طلب کتاب کے باب میں آیا تھا، اس میں مندرج تھا۔ کہ اب میں سورت کو جاتا ہوں، تم اجزاے کتاب کا پارسل اس پتے سے سورت بھیجنا۔ بھائی میں نے اسی پتے سے خط بھیجا تھا، نہ پہنچے تو میرا کیا گناہ۔ پیڈ خط گاہ گاہ تلف بھی ہو جاتا ہے، نظر اس بات پر، یہ خط تم کو بیرنگ بھیجتا ہوں تاکہ ضائع نہ ہونے کا احتمال قوی رہے۔ فقط

صبح دوشنبہ ۱۴ ربیع الثانی مطابق ۱۷۔ ستمبر سال حال[۲] غالب

(۱۴)

منشی صاحب،

یہ کیا اتفاق ہے کہ میری بات کوئی نہیں سمجھتا:

---

[۱] مراد ہے میر غلام بابا خان

[۲] ۱۴۔ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۷۔ ستمبر سنہ ۱۸۶۴ء

کس زبانِ مرا نمے فہمد   بہ عزیزاں چہ التماس کنم

یاد کرو اصل مقدمہ یہ تھا کہ مَیں "قاطع برہان" کو دوبارہ چھپوانا چاہتا ہوں، نواب صاحب مدد دیں۔ یعنی دو سو جلدیں خرید لیں۔ حضرت صاحب نے ایک گھڑی عنایت فرمائی۔ بھلا یہ میرے کس کام کی؟ چار دن سوچا کیا کہ پھیر دوں، پھر سوچا کہ بُرا مانیں گے۔ آخر کو گھڑی رکھ لی اور یہ خیال کیا کہ کتاب کے انطباع کے بعد سو ڈیڑھ سو جلدیں بھیج دوں گا۔ اسی خط کے ساتھ نواب صاحب کے نام کا خط گھڑی کی رسید کا تم کو پہنچتا ہے اور یہ بھی تم کو معلوم رہے کہ گھڑی کی کنجی نہیں آئی۔ ظاہرا، سہو سے وہیں رہ گئی ہوگی۔

ہاں صاحب، ۳۰ جلدیں "لطائف غیبی" کی دو پارسلوں میں آ گئے بھیجی ہیں، جس کی قیمت دس روپے مجھ کو پہنچے۔ فی الحال ایک جلد اور اپنی طرف سے بھیجی ہے۔ رسید جلد لکھو۔

۳۔ دسمبر ۱۸۶۴ء   غالب

(۱۵)

سعادت و اقبال نشان، سیف الحق منشی میاں داد خاں سیّاح کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ خط میں آپ نے بہت سے مطالب لکھے، مگر تیس کتابوں کے دو پارسلوں کی رسید نہیں لکھی۔ یہ ایک پارسل جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے، اس میں وہی "لطائف غیبی" ہے جس کو مَیں نے اپنے مطالعے میں رکھ کر صحیح کیا ہے۔ اس کے بھیجنے سے یہ مدعا کہ تم ان تیس رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو اور اگر چھوٹے صاحب نے رکھ لیا ہے، تو اُن سے مستعار لے کر اپنی سب کتابیں صحیح کر لو اور وہ نسخہ ان کی نذر کر دو۔ صاحب، مَیں نے اپنے صرف زر سے "لطائف غیبی" کی جلدیں نہیں چھپوائیں، مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں۔ بیس مَیں نے مول لیں، تیس تم کو دلوا دیں۔ بیس

بھائی ضیاء الدین نے لیں ۔ دس مصطفےٰ خاں صاحب نے لیں ۔ باقی کا حال مجھے معلوم نہیں ۔

دیکھو سیف الحق، شیخ سعدی کا قول کیا سچا ہے :

اگر دنیا نہ باشد دردمندم　　وگر باشد، بہ مہرش پائے بندم

بلائے زیں جہاں آشوب ترنیست　　کہ رنج خاطر است، ار ہست ور نیست

جہاں دولت نہیں وہاں مصیبت ہے، جہاں دولت ہے وہاں خصومت ہے۔ میں تو میر غلام بابا خان کا دوست ہوں، ان کی فتح کی دُعا مانگتا ہوں۔ آپ اتنی مہربانی کریں کہ یہ حالات جو واقع ہوا کریں، وہ مجھ کو لکھا کریں۔

غربیلہ کی ہندی "چھلنی" ہے فارسی میں غربیلہ بولتے ہیں۔

پنجم شعبان ۱۲۸۱ھ

مطابق ۳ جنوری ۱۸۶۵ء　　نجات کا طالب غالب

(۱۶)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان سیف الحق میاں داد خاں سلّمکم اللہ تعالیٰ،

فقیر کی طرف سے دعا و سلام قبول کریں ۔ چھوٹے صاحب کی تصویر کی رسید میں بھائی محمد حسین خاں سے کہا گیا تھا کہ تم تصویر کے پہنچنے کی اطلاع دے دینا، سو اب تمھاری تحریر سے معلوم ہُوا کہ انھوں نے اطلاع دی ہے۔ حال تصویر کا یہ، کہ مَیں نے اسے سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا، گویا چھوٹے صاحب کو دیکھا۔ لیکن اس کا سبب نہ معلوم ہُوا کہ نواب صاحب نے ہم سے بات نہ کی۔ خیر دیدار تو میسّر ہوا، گفتار بھی اگر خدا چاہے گا تو سُن لیں گے۔ دیکھو منشی صاحب آئینہ کی تصویر[1] کی صنعت کو سب پسند کرتے ہیں، مگر فقیر اس کا معتقد نہیں۔ اب دیکھو حضرت کی

---

[1] فوٹو

تصویر ہیں کہنیوں تک ہاتھ کی تصویر ہے، آگے پہنچے اور نیچے کا پتہ نہیں۔ مکالمہ ایک ایک طرف مصافحہ کی بھی حسرت رہ گئی۔ اس وقت جداگانہ خط لکھنے کی فرصت نہیں۔ نواب صاحب سے میرا بہت بہت سلام اور اشتیاق کہنا، بلکہ یہ خط ان کو ضرور دینا کہ وہ پڑھ لیں۔ مَیں سادات کا نیازمند اور علیؓ کا غلام ہوں :

بندۂ شاہِ شمائیم و ثنا خوانِ شما

۱۷۔ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۳۔ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء نجات کا طالب غالبؔ

(۱۷)

صاحب،

مہربانی نامہ، کہ گویا الفاظ اس کے سراسر نواب میر غلام بابا خاں صاحب کی زبانی تھے، پہنچا۔ جواب لکھتا ہوں اور پرسش کا شکر بجا لاتا ہوں۔ ایک قرن بارہ برس سے فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والی رام پور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے اور سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بسبیل ہنڈوی بھجواتے تھے۔ اس مغفور کی اندازہ دانی دیکھیے کہ مجھ سے کبھی اس روپے کی رسید نہیں لی۔ اپنے خط میں ہنڈوی بھیجا کرتے، مَیں خط کا جواب لکھ بھیجتا۔ اس ماہانہ کے علاوہ کبھی دو سو کبھی ڈھائی سو بھیجتے رہتے۔ فتنہ و فساد کے دنوں میں قلعہ کی آمد مفقود، انگریزی پنشن مسدود۔ یہ بزرگوار وجہ مقرری ماہ بماہ اور فتوح گاہ گاہ بھیجتا رہا۔ تب میری اور میرے متوسلوں کی زلیست ہوئی۔ رئیس حال کو خدا بدولت و اقبال ابداً موبداً سلامت رکھے۔ وجہ مقرری کی ہنڈوی ہر مہینے بحسب دستور قدیم بھیجے جاتا ہے۔ فتوح کی رسم دیکھیے جاری رہے یا نہیں۔

میرے پاس روپیہ کہاں جو "قاطع برہان" کو دوبارہ چھپواؤں؟ پہلے بھی

۱۔ نواب کلب علی خاں والی رام پور۔

نواب مغفور نے دو سو روپے بھیج دیئے تھے، تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری کے ساتھ دو سو پہنچیں گے۔ وہ آخر اپریل ۱۸۶۵ء حال میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ رئیس حال سے میں نے پایا۔ مصرف کتاب کا روپیہ نہ آیا۔ یاد دلاؤں گا مگر اس مرحوم کا وعدہ سررشتۂ دفتر سے نہ تھا، جو از روے دفتر اس کی تصدیق ہو۔ بہ ہر حال فکر میں ہوں۔ اگر اسباب نے مساعدت کی فھو المراد، ورنہ:

آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

منشی صاحب، اس خط کو ضروری جان کر بیرنگ بھیجتا ہوں۔

۳۰۔ جولائی ۱۸۶۵ء نجات کا طالب، غالب

(۱۸)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، منشی میاں داد خاں سیّاح، سیف الحق، سلمکم اللہ تعالیٰ،

دعا اور سلام اور شکر اور سپاس۔ تمھارا خط مرقومہ ۳۰۔ اگست پرسوں بروز جمعہ ۸ ستمبر ۱۸۶۵ء کو پہنچا۔ کل دسویں ستمبر ماہ حال کو سو روپے مندرجہ اس کے ایک صراف سے وصول ہو گئے۔ چھوٹے صاحب نے بڑی جوانمردی اور بڑی ہمّت کی۔ اس صرف میں میرا کام ہُوا اور ان کا نام ہُوا۔ اللہ اللہ! اب بھی ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ نہ مَیں نے ان کو دیکھا، نہ اُنھوں نے مجھ کو دیکھا۔ نہ میرا کوئی حق اُن پر ثابت، نہ اُن کو کوئی خدمت مجھ سے لینی منظور۔ خیر فقیر ہوں جب تک جیوں گا دعا دوں گا۔ تمام عمر ممنون اور شرمندہ رہوں گا۔ تمھارا بھی احسان مانوں گا۔ اب دو ایک دن میں کاغذ آ جائے تو اس کا انطباع شروع ہو جائے۔ تم نواب صاحب کو میرا سلام کہو اور یہ خط دکھا دو اور عرض

کرو کہ آج تک کسی بھائی یا کسی دوست کا روپے پیسے کا احسان مند نہیں ہُوا تھا اب احسان بھی اٹھایا تو اپنے آقا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فرزند کا۔

وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملّائے مکتب دار کا خبط ہے۔ رحیم بیگ اس کا نام، میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہوگیا ہے۔ باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریریں مَیں نے دیکھی، تم کو بھی بھیجوں گا۔ مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں، جن کو "لطائفِ غیبی" میں رد کر چکے ہو۔ بہ ہر حال اس کے جواب کی فکر نہ کرنا۔ فقط والسلام والاکرام۔

دوشنبہ ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء نجات کا طالب غالبؔ

(۱۹)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان سیف الحق میاں داد خاں۔ تم سلامت رہو، تمھارے خط کے صفحۂ سادہ پر یہ سطریں رقم کرتا ہوں تاکہ تم اپنے خط کے پہنچنے سے اطلاع پاؤ۔ "نامۂ غالب" صاحب مطبع نے اپنی بکری کے واسطے نہیں چھاپی، جو مَیں مول لے کر بھیجوں اور تم سے اس کی قیمت مانگ لوں۔ مَیں نے آپ تین سو جلدیں چھپوائیں۔ دُور و نزدیک بانٹ دیں۔ آج یکشنبہ ہے، پارسل روانہ نہ ہو گا۔ جتنے یہ نسخے اب میرے پاس باقی ہیں، کل تمھیں بھیج دوں گا۔

ہاں صاحب، سو روپے کا نوٹ پہنچا اور روپیہ وصول ہُوا۔ کاپی[1] آج شروع ہو گئی ہے جس دن نوٹ پہنچا، اس کے دوسرے دن روپیہ مل گیا۔ تیسرے دن مَیں نے تم کو تمھارے رجسٹری دار خط کا جواب لکھ بھیجا۔ یقین ہے کہ میرا خط پہنچ گیا ہوگا اور تم نے بموجب میری خواہش کے نواب صاحب کو دکھا دیا ہوگا۔ کل حضرت کا بھی ایک خط

---

[1] یعنی "قاطع برہان" کی کاپی۔

آیا ہے۔اس کا جواب بھی آج تمہارے خط کے ساتھ ارسال ہوتا ہے۔ بندہ پرور، سچ کہتے ہو رحیم بیگ کا وطن اصلی سردہنہ اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلمی اس کا پیشہ ہے، اور ۸ - ۱۰ برس سے اندھا۔ نظم و نثر میں مولوی امام بخش صہبائی کا شاگرد اور فارسی شعر کہتا ہے۔

یکشنبہ ۱۷۔ستمبر ۱۸۶۵ء   راقم غالب علی شاہ

(۲۰)

صاحب،

مَیں خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ تم اپنے وطن گئے اور عزیزانِ وطن کو دیکھ کر خوش ہُوئے اور مع الخیر والعافیتہ اپنے محسن و مربی کی خدمت میں پھر آپہنچے۔ نواب صاحب سے میرا بہت سلام کہنا اور کہنا کہ اس خط میں سلام صرف وفور اشتیاق سے لکھا ہے۔ محبت نامہ جداگانہ جلد بھیجوں گا۔

اجی ہاں میاں سیف الحق رام پور سے آکر تین سو جلدیں "درفش کاویانی"[1] کی تیار پائیں۔ نواب میر غلام بابا خاں صاحب سے حصّہ برادرانہ کو ڈیڑھ سو جلد کا پشتارہ بنوایا۔ اس پر ٹاٹ لپٹوایا، ڈاک گھر بھجوایا۔ مسترد آیا۔ سرکاری ڈاک والوں نے ہرگز اس کا بھیجنا قبول نہ کیا۔ ٹھیکے والے، پمفلٹ پاکٹ والے، ریل والے متفق اللفظ اس کے ارسال سے انکار کرتے ہیں۔ تم یہ رقعہ حضرت کو پڑھواؤ اور اس باب میں جو وہ فرمائیں، وہ مجھ کو لکھو۔ مدعا یہ ہے کہ کسی طرح یہ پشتارہ وہاں پہنچ جائے۔ اس خط کا جواب جس قدر جلد لکھو گے مجھ پر زیادہ احسان کرو گے۔

سہ شنبہ ۲۳۔جنوری ۱۸۶۶ء   نجات کا طالب غالب

(۲۱)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، سیف الحق میاں داد خاں کو فقیر اسد اللہ

---

[1] میرزا نے "قاطع برہان" کو دوبارہ چھپوایا تھا تو اس کا نام درفش کاویانی رکھا تھا۔

کا سلام۔ کل سہ شنبہ فروری صبح کے وقت چھ پارسل ۳۶ "درفش کاویانی" کے نواب میر غلام بابا خاں صاحب کی خدمت میں ارسال کیے۔ کل ہی شام کے وقت آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ حال معلوم ہُوا۔ خیر، اب اور نہ بھیجوں گا۔

صاحب، یہ تم نے پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بھیجے؟ مَیں نہ کتاب فروش، نہ دلال۔ یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی اور تم نے بُرا کیا۔ حضرت ۱۶ جلدیں "لطائف غیبی" کی بھیج کر اس کے پان سات دن کے بعد بیس "نامۂ غالب" کا پارسل ارسال کیا ہے "لطائف" کی رسید تم نے بھیج دی، یقین ہے کہ "نامۂ غالب" کا پارسل بھی پہنچ جائے گا۔ گھبراؤ نہیں۔ نواب صاحب کی خدمت میں میرا سلام اور اشتیاق ملاقات عرض کرنا۔

۲۱۔ فروری ۱۸۶۶ء نجات کا طالب غالب

(۲۲)

خان صاحب، سعادت و اقبال نشان، میاں داد خان سیّاح کو فقیر گوشہ نشین کا سلام پہنچے۔ تمھارا کوئی خط، سوائے اس خط کے، جس کا جواب لکھتا ہوں، ہرگز نہیں پہنچا۔ بہت دن سے مجھ کو خیال تھا کہ مولانا سیّاح نے مجھ کو یاد نہیں کیا۔ کل ناگاہ تمھارا خط پہنچا۔ آج اس کا جواب لکھتا ہوں۔

مُہر میں تو کھودنے کا نہیں جو اس قدر عذر چاہتے ہو، کھدوا دینے میں کیا تکلیف اور کیا زحمت؟ مَیں احباب کا خادم ہوں۔ میر غلام بابا خاں سے میرا سلام کہیے اور وہ نگین مع نقشہ بے تکلف بھیج دیجیے۔ آپ کے حکم کی تعمیل اور اس نگین کی درستی ہو جائے گی۔ خاطر جمع رہے۔ زیادہ کیا لکھوں؟

اجی سیّاح صاحب ہمارا دھیان تم میں لگا رہتا ہے۔ کبھی کبھی خط لکھتے رہا کرو۔ مَیں ایسا گمان کرتا ہوں کہ اگر میر غلام بابا خان صاحب کو مُہر کھدوانی نہ ہوتی اور وہ تم سے

نہ کہتے تو تم ہرگز مجھ کو خط نہ لکھتے۔ یہ تمھارا خط گویا میر غلام بابا خاں کے حسب الحکم تھا۔ کہ انھیں کو اس کا جواب لکھوں اور ان کے نام کا خط بھیجوں۔ مگر پھر سوچا کہ تم آزردہ ہو جاؤ گے۔ تمھیں کو خط لکھا۔ بھائی، یہ طریقہ فراموش کاری کا اچھا نہیں۔ گاہ گاہ خط لکھا کرو۔ والسلام

یکم مارچ ۱۸۶۶ء — نجات کا طالب غالب

(۲۳)

اقبال نشان، سیف الحق کو دُعا پہنچے۔ پانچ اشتہار اخبار کی خریداری کے اور تین اشتہار کتاب کی خریداری کے آپ کے پاس پہنچتے ہیں۔ چھوٹے صاحب کو ملاحظہ کروائیے اور اطراف و جوانب دُور و نزدیک بھیجیے۔ جو صاحب کتاب و اخبار دونوں کے خریدار ہوں، وہ اس کے خریدنے کی اطلاع کا خط میر فخرالدین مہتمم اکمل المطابع کے نام لکھیں اور وہ خط میرے پاس بھیج دیں۔ جو صاحب فقط اخبار کے خریدار ہوں وہ اس کی اطلاع کا خط لکھیں۔

۲۲۔ مارچ ۱۸۶۶ء — غالب

(۲۴)

مولانا سیف الحق،

اب تو کوئی خط تمھارا نوٹ اور ہنڈوی اور ٹکٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ بھلا یہ تو فرمائیے کہ یہ ڈھائی روپے کس بابت کے اور کس جنس کی قیمت کے ہیں؟ اگلے پانچ روپے پر میں بے مزہ ہُوا تھا، یہ ڈھائی اور طرہ ہُوے۔ بہرحال ان کا حال لکھو کہ کیسے ہیں اور کاہے کے ہیں؟ اس رقعے کا جواب جلد لکھو۔ ٹوپیاں بعد عید بھیجی جائیں گی۔

۲۳۔ اپریل ۱۸۶۶ء — عنایت کا طالب غالب

(۲۵)

صاحب،

میرا سلام، تمھارا خط پہنچا دونوں غزلیں دیکھیں، خوش ہُوا۔ فقیر کا شیوہ خوشامد نہیں اور فن شعر میں اگر اس شیوے کی رعایت کی جائے تو شاگرد ناقص رہ جاتا ہے۔ یاد کرو، کبھی کوئی غزل تمھاری اس طرح کی نہیں ہُوئی کہ جس میں اصلاح نہ ہُوئی ہو، خصوصاً روزمرۂ اُردو میں۔ دونوں غزلیں لفظاً اور معنیً بے عیب ہیں۔ کہیں اصلاح کی حاجت نہیں۔ آفرین اور صد ہزار آفرین۔

میر غلام بابا خاں صاحب اگر واقعی ایسے ہی ہیں، جیسے تم لکھتے ہو۔ تو بیشک وہ شخص ہزاروں میں ایک ہے۔ لاریب فیہ۔ کیا فرمایش کروں اور کیا تم سے منگاؤں؟ وہاں کونسی چیز ہے کہ یہاں نہیں۔ آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں، انگور سے کم عزیز نہیں۔ لیکن بمبئی اور سورت سے یہاں پہنچنے کی کیا صورت؟ مالدے کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کرکے مشہور ہے۔ اچھا ہوتا ہے۔ کمال یہ کہ وہاں بہت اچھا ہو گا۔ سورت سے دلّی آم بھیجنے محض تکلف ہے۔ روپے کے آم اور چار روپے محصول ڈاک اور پھر سو سے شاید دس پہنچیں۔ میرے سر کی قسم کبھی ایسا ارادہ نہ کرنا۔ یہاں دیسی آم انواع و اقسام کے بہت پاکیزہ، لذیذ اور خوشبو[1] افراط سے ہیں۔ پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ رام پور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر بسبیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔ اے لو! آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست[2] کی بھیجی ہوئی آئی۔ دو ٹوکرے، ہر ٹوکرے میں سو آم۔ کلو داروغہ نے میرے سامنے وہ ٹوکرے کھولے۔ دو سو میں سے تراسی آم

۱؎ یعنی انھیں سونگھا جائے تو بہت اچھے معلوم ہوں۔
۲؎ قاضی عبدالجمیل جنوں

اچھے نکلے اور ایک سو سترہ آم بالکل سڑے ہوے۔ اوائل جون، ماہ حال میں ایک ہفتہ مینہ برس کر پھر اب وہی آگ برس رہی ہے اور لُو چل رہی ہے۔

۱۷- جون ۱۸۶۶ء

(۲۶)

بھائی سیف الحق، تمھارا خط پہنچا۔ قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو۔ اگر کوئی وجہ اپنے پر ان کے عتاب کی پاتا تو اُن سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کرواتا۔ جب سبب ملال کا ظاہر نہیں تو مَیں کیا کروں۔ تم بُرا نہ مانو، کس واسطے کہ اگر مَیں برا ہوں، تو اس نے سچ کہا اور اگر مَیں اچھا ہوں اور اس نے بُرا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کرو:

غالب بُرا نہ مان جو دشمن بُرا کہیں ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

صاحب، اس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کہاں کھچا کھچا پھروں؟ گوشہ نشین آدمی، عکس کی تصویر اُتارنے والے کو کہاں ڈھونڈوں؟ دیکھو ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھچی ہوئی ہے، اگر ہاتھ آجائے گی تو وہ ورق بھیج دوں گا۔

اجی، وہ تو مَیں نے نواب صاحب کو ہنسی سے ایک بات لکھی تھی۔ دوستانہ اختلاط تھا۔ بھئی مَیں بہرا ہوں، گانا کیا سُنوں گا؟ بوڑھا ہوں، ناچ کیا دیکھوں گا؟ غذا چھ ماشے آٹا، کھانا کیا کھاؤں گا؟ ممبئی، سورت میں انگریزی شرابیں ہوتی ہیں اگر وہاں آتا اور شریک محفل ہوتا تو پی لیتا۔

۵- ستمبر ۱۸۶۶ء نجات کا طالب غالب

(۲۷)

صاحب،

مَیں تم سے شرمندہ (ہوں)، پہلا خط تمھارا مع قصیدہ پہنچا۔ میں قصیدہ کسی کتاب میں

رکھ کر بھول گیا۔ اب دوسرا خط دیکھ کر قصیدہ یاد آیا، ہر چند ڈھونڈا، نہ پایا۔ بڑی بات یہ ہے کہ اس قدر مجھ کو یاد ہے کہ اسی وقت میں نے ان اشعار کو سراسر دیکھ لیا تھا۔ اشعار سب ہموار تھے۔ تم اندیشہ نہ کرو اور قصیدہ نذر گزرانو اور مع الخیر وطن کو جاؤ۔ لیکن بھائی وطن پہنچ کر ضرور مجھ کو خط لکھنا اور اپنے گھر کا پتہ لکھنا تاکہ میں اس نشان سے تم کو خط بھیجوں۔ نواب میر غلام بابا خاں صاحب کو فقیر کی طرف سے سلام کہنا فقط۔

صبح سہ شنبہ ۱۸۔ نومبر ۱۸۶۶ء

(۲۸)

منشی صاحب،

وہی جہان، وہی زمین، وہی آسمان، وہی سورت، وہی دِلّی، وہی نواب میر غلام بابا خان، وہی سیف الحق سیّاح، وہی غالب نیم جان۔ انگریزی ڈاک جاری، ہرکاروں کو ریل کی سواری، ربیع الاول میں تمھارا خط آیا، ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب، آج شعبان کی ۲۶ ہے۔ صبح کے وقت یہ خط لکھ رہا ہوں۔ ۸ بج گئے ہیں۔ اس وقت تک نہ تمھارا کوئی خط آیا، نہ کوئی نواب صاحب کا عنایت نامہ۔ واسطے خدا کے میرے اس خط کا جواب جلد لکھو اور اس خط میں ترک نامہ و پیام کا سبب لکھو۔ آج ہی کے دن ایک پارسل چھ ٹوپیوں کا ارسال کرتا ہوں۔ خدا کرے، پارسل پہنچ جائے اور ٹوپیاں تمھارے پسند آئیں۔ نواب صاحب کی خدمت میں میرا سلام پہنچانا اور عتاب کی وجہ دریافت کر کے لکھنا۔ خط بیرنگ ہے اور پارسل پیڈ۔

۳۔ جنوری ۱۸۶۷ء　　　　نجات کا طالب غالب

۲۹

منشی صاحب شفیق، بدل مہربان، عزیز تر از جاں، سیف الحق میاں داد خان، کو

فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ پرسوں نواب صاحب کا خط آیا۔ صاحب ٹوپیوں کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے "لطائف غیبی" کی ۱۵ جلدیں سات روپے آٹھ آنے دام بھیج کر منگوائیں، پھر دو روپے کے ٹکٹ بھیج کر ٹوپیاں منگوائیں۔ مَیں نے تمھارے بھیجے ہُوئے روپوں کی ٹوپیاں خرید کر تم کو بھیج دیں۔ چاہے تم پہنو، چاہے چھوٹے صاحب کی نذر کرو۔

تمھیں جو مَیں نے "سیف الحق" خطاب دیا ہے اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو، تم میرے بازو ہو، میرے نطق کی تلوار تمھارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔ "لطائف غیبی" نے اعدا کی دھجیاں اُڑا دیں۔

ایک نئی بات سنو۔ محمد مرزا خاں میرے سبطی بھائی کا نواسا ہے۔ اس نے ایک اخبار نکالا ہے مسمیٰ بہ "اشرف الاخبار"۔ اس کا ایک نفافہ تم کو بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم کر لو گے کہ تمھارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پر چھاپا گیا ہے[۱]۔ اس ارسالِ اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے۔ ہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ چھوٹے صاحب کی بھی نظر سے گزر جائے اور اس سرکار میں یہ اخبار خرید کیا جائے اور تم ان کی طرف سے حکم خریداری ابتداء جنوری ۱۸۶۶ء سے بنام محمد مرزا خاں لکھو اور وہ خط اس پتے سے دلّی روانہ کرو، جو ان کے اخبار کے آخر میں لکھا ہے۔

حیران ہوں کہ چھوٹے صاحب کے خط کا کیا جواب لکھوں۔ انھوں نے مجھے شرمندہ کیا۔ آپنے کو چھوٹا اور مجھ کو بزرگ لکھا۔ سیّد تو سب مسلمانوں کے بزرگ ہوتے ہیں، میں تو مسلمانوں میں بھی ایک ذلیل، علیل، فقیر، حقیر آدمی ہوں۔ یہ ان کی بزرگی، ان کی خوبی، ان کی مہربانی ہے۔ حق تعالیٰ ان کو سلامت رکھے اور ان

---

[۱] اس سے ظاہر ہے کہ غالب نے خود ہی اعتراض لکھ کر سیّاح کے نام سے اخبار میں چھپوا دیا تھا۔ اسی طرح "لطائف غیبی" خود لکھی اور سیّاح کے نام سے چھاپی۔

مقدمات میں من کُل الوجوہ ان کو فتح و ظفر نصیب ہو۔ میرا سلام کہنا اور یہ عبارت پڑھا دینا۔

ہاں صاحب، برادر بجان برابر میرزا معین الدین حسین خاں بہادر کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ بھائی میرا جی دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ پہلے برخوردار شہاب الدین خاں صاحب سے پوچھو، وہ اجازت دے تو فوراً ریل پیل کرتے چلے آؤ۔ فقط

سہ شنبہ، ۷ شوال ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۲ ۔فروری ۱۸۶۷ء دیدار کا طالب غالب

(۳۰)

بھائی،

تم جیتے رہو اور مراتب علیا کو پہنچو۔ لو ایک ہنسی کی بات سُنو۔ تمھارا خط منشی کنھیالال[1] کے نام کا میرے پاس آیا۔ ہر چند مَیں نے خیال کیا، اس نام کا کوئی آشنا مجھے یاد نہ آیا۔ یہ نادانی ان کی کہ مجھ سے کہہ نہ دیا کہ میرے نام کا خط آئے تو میرے پاس بھیج دینا۔ بے خبری ہیں۔ جو خط آیا، مَیں نہ نام سے واقف، نہ مقام سے واقف، خط پھیر نہ دوں تو کیا کروں؟ خط کے واپس کرنے کے بعد ایک دن آپ[1]، بھائی میرزا محمد حسین خاں[2] کے ساتھ میرے پاس آئے اور تعارف قدیم یاد دلایا۔ دیکھنا میاں کیا خوب بیان ہے۔ فرماتے ہیں کہ مَیں غدر سے پہلے دو تین بار تیرے پاس حاضر ہوا ہوں۔ انصاف کرو، دو تین ملاقاتیں اور دس گیارہ برس کی بات۔ میں نسیان کا مُبتلا، میرا قصور کیا؟ بہر حال یہ شریف ہیں اور عمدہ روزگار کیے ہُوئے ہیں۔

صاحب، مَیں نے "اودھ اخبار" میں دیکھا کہ چھوٹے صاحب مقدمہ جیتے اور

ع۱ منشی کنھیالال

ع۲ میرزا معین الدین حسین خاں کے بھائی۔

اور بمبئی کے صاحبوں میں ان کی افزایش جاہ و جلال و تعظیم و توقیر کمال ہوئی ہیں تو تہنیت میں خط لکھوں گا مگر رشک آتا ہے کہ بحوالہ اودھ اخبار لکھوں اور بحوالہ سیف الحق نہ لکھوں۔ زیادہ، زیادہ

۳۱- مارچ ۱۸۶۷ء　　　　　　　　　　اسد اللہ غالب

(۳۱)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، عزیز تر از جان، سیف الحق میاں داد خاں سیّاح کو غالب کی دعا پہنچے۔ پرسوں ایک خط تمہارا اور ایک خط چھوٹے صاحب کا پہنچا۔ تمہارے خط میں پچاس پچاس روپے کے دو نوٹ پہنچے۔ سّو روپے وصول ہو گئے۔ آج تم کو اطلاع اور نواب صاحب کو شکریہ لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔ بھائی تم نے اخبار اطراف میں و جوانب میں میرا حال دیکھا ہوگا۔ مَیں اب محض نکمّا ہو گیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے پچاس جگہ سے اشعار واسطے اصلاح کے آئے ہوئے بکس میں دھرے ہیں۔ از انجملہ تین صاحبوں کے نام لکھتا ہوں۔ میر ابراہیم علی خاں صاحب، میر عالم علی خاں صاحب، نواب عباس علی خان، رئیس حال رام پور کے حقیقی ماموں۔ غرضکہ انھیں اوراق میں تمہارے کاغذ بھی دھرے ہوئے ہیں۔ جس دن ذرا افاقت پاؤں گا، تو اُن سب کاغذ کو دیکھوں گا۔

۲۳- اپریل ۱۸۶۷ء

(۳۲)

بھائی،

تمہارا خط پہنچا، آج جواب لکھتا ہوں۔ پہلے یہ پوچھتا ہوں کہ میری طرف سے جو اعتذار چھپا ہے، وہ تمہاری نظر سے گزرا ہے یا نہیں؟ نہ گزرا ہو، تو "اکمل الاخبار" ماہ شوال کے چاروں ہفتے کے دو ورقے دیکھ لو۔ ایک ہفتے میں نکل آئے گا۔

واقعی اعتراض کے جواب ایک مولوی نے لکھے ہیں۔ اس ہفتے کے "اکمل الاخبار" میں دیکھ لو۔ جو تم سے کلام کرے، اسی انداز سے تم بھی کلام کرو۔

۲۹۔ اپریل ۱۸۶۶ء نجات کا طالب غالب

(۳۲۳)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، سیف الحق منشی میاں داد خان سیاح کو غالب ناتواں نیم جاں کی دعا پہنچے۔ بھائی میرا حال اسی سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا۔ اب رعشہ و ضعفِ بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب حال یہ ہے تو کہو صاحب، میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں؟ اور پھر اس موسم میں کہ گرمی میں سر کا بھیجا پگھلا جاتا ہے، دھوپ کو دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں، صبح کو دو آدمی ہاتھوں میں لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری، اس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اس گوشۂ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بدستور لے جا کر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔ تمہاری غزلیں، میر ابراہیم علی خاں بہادر کی غزلیں، میر عالم علی خان بہادر کی غزلیں، حکیم میر احمد حسن صاحب کی غزلیں اور کیا کہوں کس کس کی غزلیں۔ یہ سب ایک جگہ دھری ہیں۔ اگر کوئی دن زندگی اور ہے اور یہ گرمی خیر سے گزر گئی تو سب غزلوں کو دیکھوں گا۔

تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصوّر صاحب میرے دوست، میرے چہرے کی تصویر اُتار کر لے گئے۔ اس کو تین مہینے ہوئے۔ آج تک بدن کا نقشہ کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینے پہ نقشہ اتروانا بھی۔ ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں۔ عید کے دن وہ آئے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ بھائی میری شبیہ کھینچ دو۔ وعدہ کیا تھا کہ کل نہیں تو پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ،

محرم، یہ پانچواں مہینہ ہے۔ آج تک نہیں آئے۔

آغا غلام حسین خاں صاحب کا قطعہ پہنچا۔ اس میں کچھ تو شعر اصلاح طلب بھی تھے، اب اصلاح دے کون؟ مَیں تو اپنی مصیبت میں گرفتار۔ بارے ایک میرا شاگردِ رشید منشی ہرگوپال تفتہ بسواری ریل میرے دیکھنے کو آیا تھا اس کو موقع و محل بتادیا، جو مَیں کہتا گیا، اسی طرح وہ بناتا گیا۔ وہ قطعے کا کاغذ بعد اصلاح کے "اکمل المطابع" میں بھیج دیا۔ ہفتہ آیندہ میں تم بھی دیکھ لوگے۔

۱۱۔ جون ۱۸۶۷ء مرگِ ناگاہ کا طالب، غالب

(۳۴)

نورِ چشم، اقبال نشان، سیف الحق، میاں داد خان سیّاح کو غالب نیم جاں کی دُعا پہنچے۔ واقعی تمھارے دو خط آئے ہیں۔ آگے مَیں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا، اب وہ بھی نہیں ہوسکتا۔ ہاتھ میں رعشہ، آنکھوں میں ضعفِ بصر۔ کوئی متصدی میرا نوکر نہیں۔ دوست آشنا کوئی آجاتا ہے تو اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔

بھائی، مَیں تو کوئی دن کا مہمان ہوں۔ اور اخبار والے میرا کیا حال جانیں؟ ہاں، "اکمل الاخبار" اور "اشرف الاخبار والے" کہ یہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں، سوان کے اخبار میں مَیں نے اپنا مفصل حال چھپوا دیا ہے اور اس میں مَیں نے عذر چاہا خطوں کے جواب اور اشعار کی اصلاح سے اس پر کسی نے عمل نہ کیا۔ اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاحوں کے چلے آتے ہیں اور مَیں شرمندہ ہوتا ہوں۔ بوڑھا، اپاہج، پورا بہرہ، آدھا اندھا، دن رات پڑا رہتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے تلے دھری رہتی ہے۔ نشست، چوکی پلنگ کے پاس لگا رہتا ہے۔ سو نشست چوکی پر تیسرے چوتھے دن اتفاق جانے کا ہوتا ہے۔ اور حاجتی کی حاجت بسبب سرعت بول کے گھنٹہ بھر

میں پانچ چھ بار ہوتی ہے۔

تصویر کھینچنے والا جو ہندوستانی ایک دوست تھا، شہر سے چلا گیا۔ ایک انگریز ہے، وہ کھینچتا ہے۔ مجھ میں اتنا دم کہاں کہ کوٹھے پر سے اُتروں، پالکی میں بیٹھوں اور اس کے گھر جاؤں اور گھنٹہ دو گھنٹے کرسی پر بیٹھوں اور تصویر کھنچوا کر جیتا جاگتا اپنے گھر پھر آؤں۔ اب تم ازراہِ مہربانی میرا ابراہیم علی خاں بہادر اور حکیم سیّد احمد حسن صاحب کو، اور جب بمبئی سے واپس آجائیں، نواب غلام بابا خان کو یہ خط پڑھوا دینا۔ تمھارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہُوا، بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ ۷۱ برس کی عمر تک سات بچّے پیدا ہُوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔ تم ابھی جوان ہو۔ حق تعالیٰ تمھیں صبر اور نعم البدل دے۔ والسّلام

۲۵۔ اگست ۱۸۶۷ء غالب

(۳۵)

صاحب،

تمھارے خط کے پہنچنے سے کمال خوشی ہوئی۔ ٹوپیاں اگرچہ تمھارے سر پہ ٹھیک نہ آئیں، لیکن ضائع نہ گئیں۔ میرے شفیق اور تمھارے مربّی کے صرف میں آئیں۔ تم کو اور ٹوپیاں بھیجوں گا۔

مصوّر سے سخت عاجز ہوں۔ وعدہ ہی وعدہ ہے، وفا کا نام نہیں

کلیات میر تقی کا انتخاب تمھارے خط کے پہنچنے سے دو دن پہلے میر فخرالدین نے ارسال کر دیا۔ ٹکٹ اُن کے حوالے کر دیئے۔

حضرت بہتان لگانے کی خو کس سے سیکھے ہو؟ میرے پاس کوئی غزل تمھاری نہیں ہے۔ نواب صاحب کو سلام کہنا اور میری زبانی کہنا کہ ٹوپیوں کو میرا ارمغان

"مضامین شعری را کما ینبغی مے فہمید و بہ جمیع نکات و لطائف بہ بادی النظر پے مے برد۔ بالجملہ نکتہ سنج و نغز گفتارے بود کہ مثلش کمتر مرئی ..... الخ

ہجو و مزاح میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ اردو اور فارسی کی دونوں زبانوں میں ان کی ہجویں اور مزاحیہ نظمیں موجود ہیں۔

سنہ ۱۲۷۱ھ (۵۵-۱۸۵۴ء) میں حیدرآباد آئے۔ اس وقت اٹھائیس برس کی عمر تھی تینتیس برس ملازم رہنے کے بعد سنہ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں فالج سے وفات پائی صرف ۶۱ برس کی عمر تھی چنچل گوڑہ میں دفن ہوئے۔

آپ نے دو شادیاں کیں، پہلی بی بی کے بطن سے ایک لڑکا اور لڑکی، دوسری بی بی کے بطن سے صرف ایک لڑکا ہوا۔ بڑے لڑکے کا نام محمد میراں تھا۔ غالب کے خطوں میں ان کا ذکر ہے۔ یہ بھی فارسی کے شاعر تھے۔ سہا تخلص کرتے تھے صدر محاسبی سرکار عالی میں انھیں منتظم کا عہدہ حاصل تھا۔ ان کی وفات کی تاریخ معلوم نہیں۔

۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں محمد میراں نے ذکا کا متفرق فارسی اور اردو کلام نظم و نثر "خاش خماش" کے نام سے چھاپ دیا تھا۔ یہ اب بالکل کمیاب ہے۔ میرے پاس اس کا ایک ناقص نسخہ ہے۔ جس کا کاغذ اتنا بوسیدہ ہو چکا ہے کہ ورق گردانی کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا۔

دوسرے صاحبزادے محمد اسد اللہ صاحب بھی صدر محاسبی میں منتظم تھے۔ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ (اکتوبر ۱۹۲۴ء) میں بعارضہ طاعون فوت ہوئے۔

(۱)

صبح سہ شنبہ۔ ۱۳۔ صفر سال غفر (۱۲۸۰ھ) صاحب میں تم کو اخوان الصفا میں گنتا ہوں۔ اپنا نور نظر و لخت جگر جانتا ہوں۔ دیکھو تم پر مجھ کو کیا اعتماد ہے کہ خود ضبط راز نہیں کر سکتا اور تم سے رازداری اور امانت میں استواری چاہتا ہوں ۱۲ قصیدہ و غزل

میں صلا و تحسین بہ اقتضاء بخت و قسمت ہے، نہ باندازۂ ارزش کلام ١٢ ممدوح سخن فہم ہوتا تو مجھ کو متوسط کے تساہل کا وہم ہوتا، اغنیا کو نہ مذاق شعر سے نسبت، نہ مطالعہ اشعار کی فرصت۔ متوسط نے بقدر (ہمت ؟) سلسلہ جنبانی کی، لیکن مرجع نے نہ قدردانی کی ١٢

مولوی غلام غوث خاں بیخبر میر منشی لفٹننٹ گورنر مخلص خالص الاخلاص ہیں، ہرگز ان کو مدعی سے تلمذ نہیں۔ البتہ اس کو خوشگوار جانتے ہیں اور یہ کبھی نہ ہوگا کہ وہ میرا مقابلہ کریں اور "قاطع برہان" کا جواب لکھیں:

باطل ست آنچہ مدعی گوید

مدعی اپنے زعم میں مجھ کو اپنا ہم فن جان کر حسد کرتا ہے۔ میں امیر علی شیر[1] جیسا محتسب اور مولوی جامی[2] جیسا مفتی کہاں سے لاؤں جو نیاؤ کرے اور کاذب کو سزا دے؛ شکر ہے خدا کا کہ تم سخنور اور سخندان ہو اور یقین ہے کہ قلمرو ہند میں اور بھی ایسے آدمی ہوں گے کہ میرے اور مدعی کے رتبے کو ممیز ہو سکیں گے۔

عیدست بادہ شد فلک و ساغر آفتاب

خالصاً للہ، فلک ظرف اور آفتاب مظروف ہے۔ یہ شخص ظرف کو مظروف اور مظروف کو ظرف ٹھہراتا ہے۔ اس کو کون مسلم رکھے گا؟ اس سے بڑھ کر ایک اور خدشہ ہے یعنی مشبہ اور مشبہ بہ میں وجہ شبہ شرط ہے۔ آفتاب و ساغر ہیں تدویر

---

[1] نظام الدین علی شیر نوائی فرمانروائے چغتائیہ ہرات۔ سلطان حسین میرزا کا ہم مکتب تھا۔ جب سلطان حسین میرزا تخت پر بیٹھا تو یہ مصاحب بن گیا۔ اس کی سرپرستی میں ہرات علم و ہنر کا مرکز خاص بن گیا۔ خود ترکی اور فارسی کا خوش ذوق شاعر تھا۔ دونوں زبانوں میں دیوان موجود ہیں۔ مجالس النفائس کے نام سے شعرا کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا جو چھپ گیا ہے۔ مولانا جامی سے بڑی عقیدت تھی۔

[2] مولانا عبدالرحمٰن جامی جن کا درجہ بلند علم و شعر و تصوف میں کسی شرح کا محتاج نہیں۔

وجہ شبہ ہے، شراب اور فلک میں وجہ شبہ کہاں ؟ ۱۲ -

میں اپنے کو ایسا نہیں جانتا کہ تمہارے کلام کو اصلاح دوں۔ قدردانی کیوں کر کہوں، قدر افزائی کرتے ہو۔ دوستانہ، نہ اُستادانہ، جو خیال میں آئے گا کہا جائے گا اگر آپ نے اس روش کا یعنی استصلاح کا التزام کیا ہے تو جب تک کاغذ اشعار میرے پاس سے واپس نہ جایا کرے، ماکُتِبَ فیہ شہرت نہ پایا کرے۔ مجموعہ کلام سابق بھیج دو گے، میں بکمال طیب خاطر اس کو دیکھ کر بھیج دوں گا۔ استجازت کیا ضرور ؟ ۱۲ -

۱۳ صفر ۱۲۸۰ھ مطابق ۳۰ - جولائی ۱۸۶۳ء نجات کا طالب غالبؔ

(۲)

حضرت مولوی صاحب،

مَیں بیس دن سے بیمار اور تین مہینے سے صاحب فراش ہوں۔ اُٹھنے بیٹھنے کی طاقت مفقود، پھوڑوں سے بدن لالہ زار، پوست سے ہڈیاں نمودار۔ پھوڑے ایسے جیسے انگارے سلگتے ہیں۔ اعضاء پر دس جگہ پھاہے لگتے ہیں۔ ضعف و ناتوانی علاوہ، سوز غم ہائے نہانی علاوہ۔ صنعت سہل ممتنع ہیں، میں نے نواب مختار الملک[1] کو قصیدہ[2] بھیجا، کچھ قدردانی نہ فرمائی۔

رد فرقہ وہابیہ میں ایک مثنوی[3] جو سابق میں لکھی تھی، وہ محی الدولہ کو بھیجی، رسید بھی نہ آئی۔

ع۱ نواب مختار الملک میر تراب علی خاں سر سالار جنگ اوّل، جو دولتِ آصفیہ حیدرآباد کے مشہور وزیر اعظم تھے۔ ۱۸۸۳ء میں فوت ہوئے۔

ع۲ ملاحظہ ہو فارسی کلیات نظم غالبؔ صفحہ ۳۴۶ - اسی قصیدے کا ایک شعر یہ ہے :

کس نیست متاع ما خریدار با آنکہ بہا گراں نگوییم

ع۳ کلیات نظم غالب کی چھٹی مثنوی (کلیات صفحہ ۱۰۲)

اب سُنتا کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں کوس " انا ولا غیری" بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زورِ طبع دکھا رہے ہیں۔ ایک کم ستّر برس کی عمر میری ہوئی، سوائے شہرتِ خشک کے فنِ شعر کا کچھ پھل نہ پایا۔ فرماندہانِ عصر معتقد ہو گئے، مگر کچھ ہات نہ آیا۔ " احسنت " و " مرحبا " کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ خیر، ستایش کا حق ستایش سے ادا ہوا، مختار الملک نے یہ بھی نہ کیا۔ نہ مدح کی داد دی، نہ مدح کا صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب صاحب مجھے کیا سمجھے۔ محی الدولہ سے اور کچھ نہیں کہتا، مگر یہ کہ خدا سمجھے۔ ۱۲

کل سے پلنگ پر لیٹا لیٹا غزل کو دیکھ رہا ہوں اور لیٹے لیٹے یہ سطریں لکھتا ہوں:

دیدیم گل و لالہ چہار رنگ بر آورد

فقیر کے نزدیک دیدیم زائد ہے اگر یوں ہو تو بہتر ہے:

ہر یک ز گل و لالہ[۱] الخ

باشد شفقے کاں بلب لعل تو ماند　　گر چرخ بکام دل ما رنگ بر آورد

"باشد" مخل معنی ہے اگر اس کی جگہ "آرد" ہو تو بہتر، مگر "آرد" صیغہ مستقبل کا اور "آورد" ماضی کا اور فاعل دونوں فعلوں کا چرخ۔ ہر چند اساتذہ نے یوں بھی لکھا ہے، مگر فارسی گویانِ ہند نہ مانیں گے۔ پس اس شعر کو یوں لکھنا چاہیے:

حاشا کہ شفق مثل لب لعل تو باشد　　کے چرخ بکامِ دل ما رنگ بر آورد

مصرع　　خون شد دل غم دیدہ[۲] الخ

---

[۱] پورا شعر یہ ہے:

ہر یک زگل و لالہ چہار رنگ بر آورد　　رخسار تو زیں ہر دو جدا رنگ بر آورد

[۲] خوں شد دل غم دیدہ واز دیدہ فرو ریخت　　دیدی کہ جفایت چہ بلا رنگ بر آورد؟

یہ شعر ہموار ہے۔ نہ صاد کے قابل، نہ اصلاح کا محتاج۔ چوتھا اور پانچواں یہ دو شعر واہ کیا کہنا ہے[1]:

اے اہل ورع[2] الخ یہ بھی ہموار ہے نہ صاد چاہتا ہے نہ اصلاح:

گوئی کہ زباں در دہنم برگِ حنا بود   تا بوسہ زدم آں کفِ پا رنگ برآورد

مولوی صاحب، یہ بات تو کچھ نہیں۔ زبان چاٹنے کا آلہ ہے، نہ چومنے کا۔ زبان برگ حنا بن گئی تو بوسہ سے کفِ پا کیوں حنائی ہو جائے؟:

گوئی دہنم لب ز رگِ برگ حنا داشت   تا بوسہ زدم آں کفِ پا رنگ برآورد[3]

مقطع اور اس کے اُوپر کا شعر دونوں اچھے۔ اب آپ اس خط کی رسید لکھیے اور اس میں غلام امام شہید کا حال مفصل لکھیے۔ کہ ان کی وہاں کیا صورت ہے۔ ایک شخص مجھ سے یوں کہتا تھا کہ مختار الملک نے منہ نہ لگایا مگر محی الدولہ نے چار سو روپے مہینہ سرکار جناب عالی سے مقرر کرا دیا ہے۔

روز چہار شنبہ ۱۰۔ ربیع الاول سنہ ۱۲۸۰ھ[4] مطابق ۲۶۔ اگست سنہ ۱۸۶۳ء

۱؎ چوتھا اور پانچواں شعر یہ ہیں:

تا بند کشائیم ہر انگشت حنائی است
از عکس تنت بسکہ حنا رنگ برآورد

خوں کرد جگر حسرتِ اظہار تمنا
لب بستن من ہم چو حنا رنگ برآورد

۲؎ اے اہل ورع چوں نتواں داشت عزیزش
مے سرخ تر از خون شما رنگ برآورد

۳؎ ذکا نے اپنا کلام شائع کرتے وقت یہ شعر، مقطع نیز دو اور شعر حذف کر دیئے تھے۔

۴؎ مطبوعہ نسخوں میں سنہ ۱۲۶۹ھ چھپا ہوا ہے جو غلط ہے۔ صحیح سنہ ۱۲۸۰ھ ہے

(۳)

مولانا!

ایک تفقد نامہ پہلے بھیجا تھا اس کے جواب میں یہاں سے خط جواب طلب لکھا گیا تھا۔ پھر ایک اور مہربانی نامہ آیا۔ اس میں مَیں نے اپنے خط کا جواب نہ پایا۔ ناچار اس خط کے جواب کی نگارش اپنے خط جواب طلب کے پاسخ آنے پر موقوف اور ہمّت آزادانہ، نہ فطرت کیا دانہ اس تحریر کے پانے پر مصروف رکھی گئی۔ بارے وہ کل نظر افروز اور طبیعت اس کے مشاہدہ سے طرب اندوز ہوئی۔ اب درنگ ورزی کی تقصیر معاف کیجیے اور اپنی دونوں نگارشوں کا جواب بھیجیے۔

صاحب، تاریخ انطباع کلیات خوب لکھی ہے۔ مگر ہزار حیف کہ بعد از انطباع پہنچی۔ کتاب کی رونق افزا نہ ہوئی[۱]

بندہ پرور، تم چراغ دودمان مہر و وفا اور منجملہ اخوان الصفا ہو۔ مجھ سے تمھیں محبت روحانی ہے، گویا یہ جملہ تمھاری زبانی ہے۔ دوست کی بھلائی کے طالب ہو، اس شیوے میں شریک غالب ہو۔ ایک خواہش میری قبول ہو، تاکہ مجھ کو راحت حصول ہو۔ مبادی کا ذکر نہیں کرتا ہوں۔ واقعۂ حال دلنشین کرتا ہوں۔

جناب مولوی موئدالدین خاں صاحب کے بزرگوں میں اور فقیر کے بزرگوں میں

---

[۱] اس سے مراد غالباً یہ قطعہ ہے:

غالب کہ نغی مطلق اگر معنی کم است — گویم کہ ہمسرش بہ سخن کمتر آمدہ
دیوانِ او ز مطبع منشی نولکشور — طومار سعی کارگزاراں برآمدہ
تاریخ انطباع نویسد ذکا ہے — جان سخن بہ قالب طبع اندر آمدہ
صد ہاے ہا ز رشک برآمد منکراں — یک حرف ہا چہ شد تم ندا گر آمدہ

باہم وہ خلت و صفوت مرعی تھی کہ وہ مقتضی اس کی ہوئی کہ ہم میں اور ان میں برادرانہ ارتباط و اختلاط باہم رہے اور ہمیشہ یونہی بلکہ روز افزوں رہے گا۔ خط میں خط ملفوف کرنا جانب حکام سے ممنوع ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو میں ان کے نام کا خط تمھارے خط میں ملفوف کر کے بھیجتا۔ ناچار اب آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب سے ملیں اور اُن کو یہ خط اپنے نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعد سلام میرے کلیات کے پارسل کا ان کے پاس اور ان کے ذریعۂ عنایت سے اس مجلد کا حضرت فلک رفعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گزرنا اور جو کچھ اس کے گزرنے کے بعد واقع ہو، دریافت کر کے مجھ کو مطلع فرمائیں۔

جمعہ ۱۰۔ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۰ھ مطابق ۲۵۔ ستمبر سنہ ۱۸۶۳ء غالب

(۴)

بندہ پرور،

آج تمھارا عنایت نامہ آیا اور آج ہی میں نے اس کا جواب ڈاک میں اور اس خط کے ساتھ پارسل کلیات کا بھی ارسال کیا۔ دسویں بارھویں دن خط اور مہینے بیس دن میں پارسل پہنچے گا۔ خط کا جواب ضروری الارسال نہیں، لیکن پارسل کی رسید ضرور لکھیے گا۔ آپ کے خط کی عبارت تو میں سمجھا، لیکن مدعا مجھ پر نہ کھلا۔ میں نے پارسل کب آپ کے پاس بھیجا اور کب آپ کو لکھا کہ آپ یہ پارسل مویدالدین خاں کو دے دیجیے گا؟ پارسل کا لفافہ مولوی صاحب کے نام کا اور آپ کو اس کے ارسال کی اطلاع اور آپ سے یہ خواہش کہ مولوی مویدالدین خاں صاحب سے ملیے اور میرا خط جو آپ کے نام کا ہے انھیں دکھائیے اور ان سے پارسل کا حال دریافت فرمائیے۔ آپ ولایتی بھی نہیں جو میں یہ تصوّر کروں کہ اُردو عبارت سے استنباط مطلب اچھی طرح نہ کر سکے۔ بہ ہر حال اب مدعا سمجھ لیجیے اور مولوی صاحب سے ملنے کا ارادہ

فرمائیے اور پارسل کا حال معلوم کر کے لکھیے۔

۵۔ جمادی الاول ۱۲۸۰ھ روز دہم اکتوبر ۱۸۶۳ء بعد ورود نامی نامہ — داد کا طالب، غالب

(۵)

صاحب،

پہلے مطلع میں لطف نہیں۔ ہاں مضمون لطیف ہے، وہ فرد میں خوب آگیا ہے۔ مطلع ثانی بسبب تعقیدلت کے مہمل رہ گیا، ورنہ کا قافیہ اور شعر میں اور طرح سے بندھ گیا۔ تیسرا شعر الفاظ بدلنے سے بہت اچھا ہوگیا۔ جو شعر بے تصرف بدستور رہا اس کا ذکر کچھ ضرور نہیں۔

ساقی ابھی چھننی[۱] الخ

چھنی لفظ غریب ہے نہ اہلِ دہلی کے زبان زد، نہ گوش زد۔ غربال کو چھلنی کہتے ہیں جس کی فارسی پرویزن ہے اور جس کپڑے میں سائلات[۲] کو چھانیں، فارسی اس کی "لاے پالا" اور اُردو "صافی" ہے بہ یاے معروف۔ "برابر نہ ہوا تھا" الخ "تقرر وقت مرگ کا انکار حشو بلکہ مہمل ہے، مگر ہاں تقرر کا وقت ازل کو قرار دیا جائے۔ مقطع میری پسند نہیں ہے، میرے سر کی قسم اس کو نہ رکھو اور مقطع لکھ لو۔ ۱۲

شنبہ ۱۴۔ نومبر ۱۸۶۳ء — غالب

(۶)

بندہ پرور،

تمھارے دونوں خط پہنچے۔ غالب گُستہ دم کوتہ قلم نہ لکھے تو یہ اور بات ہے۔ دونوں خط آپ کے اور ایک پارسل محمد نجیب خان کا بہ تقدیم و تاخیر دوسہ روز موصول

۱؎ ذکا کا اردو کلام میری نظر سے نہیں گزرا اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ اصل شعر کیا تھا۔

۲؎ بہنے والی چیزیں۔

ہوئے آپ کا پارسل بعد مشاہدہ آپ کو بھیجا جائے گا۔ خاں صاحب کے پارسل میں ایک کتاب ارمغان اور اوراقِ اصلاح بھیجے جائیں گے۔

ہاہاہا "محرق قاطع" کا تمھارے پاس پہنچنا۔ کامے کہ خواستم ز خدا شد میسرم
میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا؟ مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصّہ آگیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کیے، دو طالب علموں نے اُردو زبان میں دو رسالے[1] جدا جدا لکھے۔ دانا ہو اور منصف ہو "محرق" کو دیکھ کر جانو گے کہ مولف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق "دافع ہذیان" و "سوالات عبدالکریم" اور "لطائف غیبی"[2] کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور "محرق" کو ڈھونڈ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے۔ "دافع ہذیان" "سوالات"، "لطائف غیبی"، تینوں نسخے ایک پارسل میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔ یقین ہے کہ بتقدیم و تاخیر یک دو روز، نظر انور سے گذریں۔ فی الحال اس پارسل کی رسید بقدرِ ورود لکھیے گا۔ جب آپ کا بھیجا ہوا نسخہ مسترد پہنچے، تو اس کی رسید رقم کی جائے گی۔ چار نسخے پارسل میں ہیں دو آپ لیجیے اور دو محمد نجیب خاں کو دیجیے۔

دوشنبہ ۲۸۔ نومبر ۱۸۶۴ء — غالب

(۷)

بندہ پرور،

کل آپ کا تفقد نامہ پہنچا، آج میں پاسخ طراز ہوا جس کاغذ پر میں یہ نقوش کھینچ رہا ہوں، آپ کے خط کا دوسرا ورق ہے۔ پہچان لیجیے اور معلوم کیجیے کہ آپ کا

---

[1] دافع ہذیان، مولفہ مولوی نجف علی۔

[2] سوالات عبدالکریم اور لطائف غیبی۔ میرے نزدیک یہ دونوں کتابیں غالب نے خود لکھی تھیں، لیکن ایک عبدالکریم کے نام سے چھپی، دوسری سیف الحق میاں داد خاں سیاح کے نام سے۔

مجموعہ کلام معجز نظام اور اس کے بعد دو خط پہنچے۔ میں صحیفہ شریفہ کی رسید لکھ چکا ہوں۔ بلکہ اسی خط میں محمد نجیب خاں کو سلام اور ارمغان کا شکر اور اوراق اشعار اصلاح طلب کی رسید میں نے لکھ دی ہے۔ پارسل کے سرنامہ سے میرا نام مٹا نہیں۔ پارسل تلف ہوا نہیں۔ آٹھ دس روز ہوئے ہوں گے کہ وہ مجلد اسی پارسل میں نہ اس کو روبرو دان کر لیا ہے، بعد ادائے محصول آپ کا نام لکھ کر روانہ کر دیا ہے۔ یقین ہے کہ بعد آپ کے خط کی روانگی کے آپ کے پاس پہنچ گیا ہوگا۔

ہاں صاحب، خط دیروزہ کے ساتھ ایک خط مولوی نجف علی صاحب کے نام، مع اس حکم کے کہ میں اس کو مولوی صاحب پاس پہنچاؤں، میں نے پایا۔ حال یہ ہے کہ مولوی صاحب سے میری ملاقات نہیں۔ صرف اتحاد معنوی کے اقتضاء سے انھوں نے دافع ہذیان لکھ کر فن سخن میں مجھ کو مدد دی ہے۔ منشی گوبند سنگھ دہلوی ایک ان کے شاگرد اور میرے آشنا ہیں۔ ان کو وہ خط بجنسہٖ بھیج دیا۔ یقین ہے کہ وہ مولوی نجف علی صاحب کو بھیج دیں گے۔ انھیں کے اظہار سے دریافت ہوا کہ مولوی صاحب مرشد آباد بنگالہ میں ہیں۔ نواب ناظم نے ان کو نوکر رکھ لیا ہے۔ ہر شخص نے بقدر حال ایک ایک قدر دان پایا، غالب سوختہ اختر کو ہنر کی داد کبھی نہ ملی:

کسم بخود نہ پذیرفت و وہر بازم بر چو نامہ کہ بود نا نوشتہ عنوانش

یہ شعر میرا ہے۔ ولیعہد خسرو دہلی[1] میرزا فتح الملک[2] بہادر مغفور کے قصیدے کا اور دیکھو ایک رباعی میری:

دستم بہ کلید مخزنے می بایست ور بود تہی بہ دامنے می بایست

یا ہیچ گہم بکس نیفتادے کار یا خود بہ زمانہ چوں منے می بایست

انا للہ و انا الیہ راجعون

---

[1] بہادر شاہ ثانی۔

[2] فخرالدین عرف مرزا فخرو، غالب کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۶ء میں فوت ہوئے۔

مجموعہ کلام معجز نظام اور اس کے بعد دو خط پہنچے۔ میں صحیفہ شریفہ کی رسید لکھ چکا ہوں۔ بلکہ اسی خط میں محمد نجیب خاں کو سلام اور ارمغان کا شکر اور اوراق اشعار اصلاح طلب کی رسید میں نے لکھ دی ہے۔ پارسل کے سرنامہ سے میرا نام مٹا نہیں۔ پارسل تلف ہوا نہیں۔ آٹھ دس روز ہوئے ہوں گے کہ وہ مجلد اسی پارسل میں۔ مَیں نے اس کو روبرواں کر لیا ہے، بعد ادائے محصول آپ کا نام لکھ کر روانہ کر دیا ہے۔ یقین ہے کہ بعد آپ کے خط کی روانگی کے آپ کے پاس پہنچ گیا ہوگا۔

ہاں صاحب! خط دیروزہ کے ساتھ ایک خط مولوی نجف علی صاحب کے نام، مع اس حکم کے کہ میں اس کو مولوی صاحب پاس پہنچاؤں، مَیں نے پایا۔ حال یہ ہے کہ مولوی صاحب سے میری ملاقات نہیں۔ صرف اتحاد معنوی کے اقتضاء سے انھوں نے دافع ہذیان لکھ کر فنِ سخن میں مجھ کو مدد دی ہے۔ منشی گوبند سنگھ دہلوی ایک اُن کے شاگرد اور میرے آشنا ہیں۔ ان کو وہ خط بجنسہٖ بھیج دیا۔ یقین ہے کہ وہ مولوی نجف علی صاحب کو بھیج دیں گے۔ انھیں کے اظہار سے دریافت ہوا کہ مولوی صاحب مرشد آباد بنگالے میں ہیں۔ نواب ناظم نے ان کو نوکر رکھ لیا ہے۔ ہر شخص نے بقدر حال ایک ایک قدر دان پایا۔ غالب سوختہ اختر کو ہنر کی داد بھی نہ ملی:

کسم بخود نہ پذیرفت و دہر بازم زد چو نامہ کہ بود نا نوشتہ عنوانش

یہ شعر میرا ہے۔ ولیعہد خسروِ دہلی[1] میرزا فتح الملک[2] بہادر مغفور کے قصیدے کا اور دیکھو ایک رباعی میری:

دستم بہ کلیدِ مخزنے می بایست در بود تہی بہ دامنے می بایست
یا ہیچ گہم بکس نیفتادے کار یا خود بہ زمانہ چوں منے می بایست

انا للہ و انا الیہ راجعون

---

[1] بہادر شاہ ثانی۔
[2] فخرالدین عرف مرزا فخرو غالب کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۶ء میں فوت ہوئے۔

(۸)

اے عنایت بہ عنایت ہم شکل۔

آپ کا خط حاوی حلِّ شبہات جس دن پہنچا، اس کے دوسرے دن جواب لکھ کر بھیج دیا۔ دو مصرعوں میں دو لفظ بدلے گئے۔ دو شعروں کے باب میں کچھ تقریر درج ہوئی۔ دو تین شعروں میں تمھاری رائے مُسلّم رہی۔ باوجود فقدان حافظہ و استیلاے نسیان ایک مصرع کا بدلا ہُوا لفظ یاد ہے:

تبدلِ مصرع: چہ غرہ غرۂ پیشانی سمندِ عمر

چہ غرہ غرۂ پیشانی تگاورِ عمر۔

دوسرا تبدل اسی قدر یاد رہ گیا ہے کہ "شبگہ و گراں رکاب" کچھ اسی طرح کے دو لفظ تھے۔ بے واؤ عاطفہ کچھ تقدم و تاخر ہو گیا ہے ۱۲۔

صبح شنبہ ۳۔ ذی الحجہ مطابق یکم مئی سال حال ۱۲ غالبؔ

(۹)

میرے شفق، میرے شفیق، مجھ سے ہیچ پوچ کے ماننے والے مجھ سے بُرے کو اچھا جاننے والے، میرے محب، میرے محبوب، تم کو میری خبر بھی ہے؟ آگے ناتواں تھا، اب نیم جاں ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہُوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آوردؔ ہے رعشہ و ضعفِ بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں، حرف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتّر برس جیا، بہت جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں اور دنوں کی ہے۔

پہلا خط تمھارا پہنچا، اس سے تمھارا مریض ہونا معلوم ہُوا۔ متواتر دوسرا خط مع غزل آیا۔ غزل کو دیکھا، سب شعر اچھے اور لطیف۔ حافظے کا یہ حال ہے کہ غزل کی زمین یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ ایک لفظ میں کوئی شعر بدلا گیا تھا۔ غرضکہ وہ غزل

؎ تحفہ وہ جو سفر سے لایا جائے۔

بعدِ مشاہدہ تم کو بھیجی گئی، اور لکھا گیا کہ نوید حصولِ صحت جلد بھیجو۔

کل ایک خط رجسٹری دار آیا، گویا ستارہ دنبالہ دار آیا۔ حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ بارے کھولا اور دیکھا۔ خط نویدِ رفعِ مرض و حصولِ صحت سے خالی اور شکوہ ہائے بیجا سے لبریز۔

صاحب، میرے نام کا خط جہاں سے روانہ ہو وہیں رہ جائے تو رہ جائے، ورنہ دلّی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا مجال ہے جو مجھ تک نہ پہنچے، وہاں کے ڈاک کے کارپردازوں کو اختیار ہے، مکتوب الیہ کو دیں یا نہ دیں۔ آپ مرزا صابر[1] کا تذکرہ مانگتے ہیں، اس کا یہ حال ہے کہ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہوگیا۔ اب ایک مجلد اس کا کہیں نظر نہیں آتا۔ بس اب مجھے اتنا لکھنا باقی ہے کہ اس خط کی رسید اور اپنی خیر و عافیت جلد لکھو۔

صبح جمعہ ۲۵ ذی حجہ سنہ ۱۲۸۲ھ ۱۲ مئی سنہ ۱۸۶۶ء — جواب خط کا طالب غالب

(۱۰)

دوست روحانی و برادر ایمانی، مولوی حبیب اللہ خاں میر منشی کو فقیر غالب کا سلام۔

تم نے یوسف علی خاں کو کہاں سے ڈھونڈ نکالا اور ان کا تخلص اور ان کا خطاب کس سے معلوم کیا؟ بغیر نشان محلہ کے ان کو خط کیوں کر بھیجا اور وہ خط ان کو کیوں کر پہنچا؟:

حیرت اندر حیرت است اے یار من

پہلے یہ تو کہو کہ "درفش کاویانی" اور وہ قطعہ جس کی پہلی بیت یہ ہے تم کو پہنچا ہے یا نہیں؟ اگر پہنچا تو مجھ کو رسید کیوں نہ لکھی؟:

---

[1] میرزا قادر بخش صابر معزالدین جہاندار، پادشاہ دلّی کی اولاد میں سے تھے "گلستانِ سخن" کے نام سے شعرا کا تذکرہ لکھا تھا، جو بہت کمیاب ہے۔ مولانا امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تذکرہ خود صہبائی نے لکھا تھا اور صابر کے نام سے شائع ہوا۔

مولوی احمد علی احمدؔ تخلص نسخۂ درخصوص گفتگوے پارسی انشا کردہ است

اگر یہ پارسل پہنچ گیا ہے تو رسید لکھو اور دیباچہ ثانی جدید کی داد دو اور اگر نہیں پہنچا تو مجھ کو اطلاع ہو کہ ایک نسخہ اور بھیجوں۔

زیستن دشوار۔ اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے تہتّرواں برس شروع ہُوا۔ غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ، قند کے شربت کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی، قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہُوئے کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اُٹھ نہیں سکتا۔ اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بن کر اٹھتا ہوں، تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ معہذا دن بھر میں دس بارہ بار اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے اٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ اسباب حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بدخواب نہیں ہوتا۔ بعد اراقت بول بے تکلف نیند آجاتی ہے۔ ایک سو باسٹھ روپے، آٹھ آنے کی آمد، ۳۰۰ کا خرچ۔ ہر مہینے میں ایک سو چالیس کا گھاٹا۔ کہو زندگی دشوار ہے یا نہیں؟ مردن ناگوار بدیہی ہے، مرنا کیوں کر گوارا ہوگا؟

بھائی یہ خط از راہ احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں جواب خط کا طالب غالبؔ

سہ شنبہ از روے جنتری ۲۶ اور از روے رویت ۲۵ رجب ۱۲۸۳ھ

اور ۴ دسمبر ۱۸۶۶ء

(۱۱)

جانان بلکہ جان، مولوی منشی حبیب اللہ خان کو غالب خستہ دل کا سلام اور نور دیدہ و سرور سینہ منشی محمد میراں[۱] کو دعا اور مجھ کو فرزند ارجمند کی نوید۔ جو نگارش

۱۔ محمد میراں فرزند میر حبیب اللہ ذکا

صاحبزادے کی طرف سے تھی، رسم الخط بعینہٖ تمھاری تھی۔ اب تم بتاؤ کہ رقعہ اس کی طرف سے تم نے لکھا ہے یا خود اس نے تحریر کیا ہے؟ لڑکا تمھارا تمھارے ساتھ حیدرآباد نہیں آیا، ظاہرا اب تم نے وطن سے بلایا ہے۔ مفصل لکھو کہ نخل مراد کا ثمر یہی ہے یا اس کے کوئی بھائی بہن اور بھی ہے؟ یہ اکیلا آیا ہے یا قبائل کو بھی اس کے ساتھ تم نے بلایا ہے؟ ہاں صاحب محمد میراں یہ اسم مقتضی اس کا ہے کہ آپ قوم کے سیّد ہوں۔ منشاء افراط پرسش وفور محبت ہے نہ فضولی۔

یوسف علی خاں شریف و عالی خاندان ہیں۔ بادشاہ دہلی کی سرکار سے تیس روپے مہینہ پاتے تھے۔ جہاں سلطنت گئی وہاں وہ تنخواہ بھی گئی۔ شاعر ہیں۔ ریختہ کہتے ہیں۔ ہوس پیشہ ہیں، مضطر ہیں۔ ہر مدعا کے حصول کو آسان سمجھتے ہیں۔ علم اسی قدر ہے کہ کچھ پڑھ لیتے ہیں۔ ان کا باپ میرا دوست تھا۔ میں ان کو بجائے فرزند سمجھتا ہوں۔ بقدر اپنی دستگاہ کے کچھ مہینہ مقرر کر دیا ہے۔ مگر بہ سبب کثرت عیال وہ ان کو مکتفی نہیں، تم اُن کی درخواست کے جواب سے قطع نظر نہ کرو گے تو کیا کرو گے؟

صاحب، میں بعین عنایت الٰہی کثیر الاحباب ہوں۔ ایک دوست نے کلکتہ سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسۂ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے، نام اس کا "مؤید برہان" ہے۔ اس رسالے میں دفع کیے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی پر کیے ہیں اور تحریر پہ کچھ اعتراضات وارد کیے ہیں اور اہل مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں۔ بس بھائی، میں نے اتنے علم پہ ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی ورق اس دوست کو اور چار جلدیں "درفش کاویانی" علاوہ اوراق مذکور بھیج دیے۔ اسی زمانے میں تین چار ورق، خوب یاد ہے، کہ "درفش" کی جلدیں رکھ رکھ کر تم کو بھیجے ہیں۔ یا تو مجھے غلط یاد ہے، یا

تم نے "درفش" کو کھول کر دیکھا نہیں۔ وہ اوراق مع "درفش" زینت طاق نسیاں ہیں۔ وہ ورق اس لفافے میں اپنے نزدیک مکرر بھیجتا ہوں۔ تم بھی دیکھو اور صاحبزادہ بھی دیکھے اور یہ جانے کہ فی الحال نظم فارسی یہی ہے اور بس

ہاں صاحب، اودھ اخبار میں ایک قصیدہ مولوی غلام امام کا دیکھا۔ "مکاں تنگ است" "جہاں تنگ است" مدح مختار الملک میں متضمن استدعائے مسکن وسیع۔ پھر مہینے بھر بعد اسی "اودھ اخبار" میں یہ خبر دیکھی کہ نواب نے مسکن تو نہ بدلا، مگر تیس روپے مہینہ بڑھا دیا۔ اسی اخبار میں پھر دیکھا گیا کہ ایک صاحب نے مولوی غلام امام کے کلام پر اعتراض کیا ہے اور ان کے شاگرد وضیع تخلص نے اس کا جواب لکھا ہے۔ آپ سے اس روداد کی تفصیل اور جواب و اعتراض و معترض کے نام کا طالب ہوں، بسبیل استعجاب۔

دو شنبہ ۱۶۔ شعبان ۱۲۸۳ھ ہجری (مطابق ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۷ء)

(۱۲)

بھائی، میں نہیں جانتا کہ تم کو مجھ سے اتنی ارادت اور مجھ کو تم سے اتنی محبت کیوں ہے، ظاہرا، معاملۂ عالم ارواح ہے۔ اسباب ظاہری کو اس میں دخل نہیں۔ تمھارے خط کا جواب مع اوراق مسودہ روانہ ہو چکا ہے، وقت پر پہنچے گا۔ "سترا بہترا" اُردو میں ترجمۂ پیر خرف ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے، پس میں "اخرف" ہوا۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا، رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی مانند معدوم ہو گیا۔ اب مہینے بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں، رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے، وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے۔ صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر، دوپہر کو گوشت کا پانی، سرِ شام گوشت کے تلے ہوئے چار کباب، سوتے ہوئے پانچ روپے بھر شراب، اور اسی قدر گلاب۔ اخرف

ہوں، پوچ ہوں، عاصی ہوں، فاسق ہوں، روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی کا میرے حسب حال ہے:

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم   القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

آج اس وقت کچھ افاقت تھی، ایک اور خط ضروری لکھنا تھا بکس کھولا تو پہلے تمہارا خط نظر پڑا۔ مکرر پڑھنے سے معلوم ہوا کہ بعض مطالب کے جواب لکھے نہیں گئے۔

ناچار اب کتابت جداگانہ میں لکھتا ہوں، تاکہ خلعت کا حال اور میرے اور حالات تم کو معلوم ہو جائیں کہ میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں دادا میرا ماوراءالنہر سے شاہ عالم[1] کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی، صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا، وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خان بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ[2] کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں[3] کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ[4] کا نوکر ہوا۔ وہاں

۱۔ شاہ عالم ثانی بادشاہ دہلی جو ۱۷۵۹ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۸۰۶ء میں مرا۔ غالب نے کئی جگہ لکھا ہے کہ اس کا دادا شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آیا اور لاہور میں معین الملک کے پاس ملازم ہوا۔ معین الملک نے شاہ عالم کی تخت نشینی سے سات آٹھ برس پہلے وفات پائی۔ لہٰذا میرزا کا دادا احمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آیا، نہ کہ شاہ عالم کے عہد میں۔ البتہ دہلی میں ملازمت شاہ عالم ہی کے عہد میں ہوئی ہوگی۔

۲۔ آصف الدولہ ابن شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ۔

۳۔ نظام علی خاں ابن نظام الملک آصف جاہ اول۔ یہ عام طور پر نظام الملک ثانی مشہور ہیں۔

۴۔ والیٔ الور

کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصر اللہ بیگ خان بہادر میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا، صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا برگڈیر ہوا۔ ایک ہزار سات سو روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کے تھی کہ بمرگ ناگاہ مرگیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا، جو باپ مرگیا۔ آٹھ برس کا تھا، جو چچا مر گیا۔ سنہ ۱۸۳۰ء[1] میں کلکتے گیا۔ نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی، سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید۔ یہ تین رقم خلعت ملا۔ زاں بعد جب دہلی میں دربار ہوا، مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر، بجرم مصاحبت بہادر شاہ، دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ میری برأت کی درخواست گزری۔ تحقیقات ہوتی رہی۔ تین برس کے بعد پنڈ چھٹا۔ اب خلعت معمولی ملا۔ غرض کہ یہ خلعت ریاست کا ہے، عوض خدمت نہیں، انعامی نہیں۔ معوج الذہن نہیں ہوں، غلط فہم نہیں ہوں، بدگمان نہیں ہوں۔ جو جس کو سمجھ لیا اس میں فرق نہیں آتا۔ دوست سے راز نہیں چھپاتا۔ کسی صاحب نے حیدرآباد سے گمنام خط ڈاک میں بھیجا۔ بند بُری طرح کیا تھا، کھولنے میں سطر کٹ گئی۔ بارے مطلب ہاتھ سے نہیں جاتا۔ بھیجنے والے کی غرض یہ تھی کہ مجھ کو تم سے رنج و ملال ہو۔ قدرت خدا کی میری محبت اور بڑھ گئی اور میں نے جانا کہ تم مجھے دل سے چاہتے ہو۔ وہ خط بجنسہٖ تمھارے پاس اس خط میں ملفوف کر کے بھیجتا ہوں۔ زنہار دستخط پہچان کر کاتب سے جھگڑا نہ کرنا۔ مدعا اس خط کے بھیجنے

---

[1] صحیح یہ ہے کہ میرزا ۱۸۲۸ء میں کلکتہ گئے اور ۱۸۲۹ء میں واپس آئے۔

سے یہ ہے کہ تمھاری ترقی منصب اور افزونی مشاہرہ اس خط سے مجھے معلوم ہوئی تھی۔

صبح جمعہ دہم شوال ۱۲۸۳ھ - ۱۵- فروری ۱۸۶۷ء

(۱۳)

جانِ غالب،

تم نے بہت دن سے مجھ کو یاد نہیں کیا۔ایک خط میرا ضروری جواب طلب گیا ہُوا ہے اور آمدورفت ڈاک کی مدت گزر گئی۔ اس کا جواب تو سو کام چھوڑ کر لکھنا تھا۔ "موئدِ برہان" میرے پاس بھی آگئی ہے اور میں اس کی خرافات کا حال بقید شمار صفحہ وسطر لکھ رہا ہوں۔ وہ تمھارے پاس بھیجوں گا۔ شرط مودت، بشرط آنکہ جاتی نہ رہی ہو اور باقی ہو، یہ ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں تم اس کا جواب لکھو۔ میرے بھیجے ہوے اقوال جہاں جہاں مناسب جانو درج کردو۔ میں اب قریب مرگ ہوں۔ غذا بالکل مفقود اور امراض مستولی۔ بہتر برس کی عمر۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میاں محمد میراں کو دعا۔

۱۴- مارچ ۱۸۶۷ء جواب کا طالب غالبؔ

(۱۴)

بندہ پرور،

آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ تمھاری اور صاحبزادے کی خیر و عافیت معلوم ہونے سے دل خوش ہُوا۔ جو آپ کی عبارت سے سمجھ گیا ہوں، اس کا جواب لیجیے اور جو نہیں سمجھا وہ مطابق میری التماس کے مجھے سمجھا دیجیے۔ عماد، عماید شعرائے قدیم میں سے ہے۔ اس کی پان سات بیت کی ایک غزل ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے:

پلے سر تا نشود راہ تو رفتن نتواں ۔۔۔ جز بہ جاروب مژہ کوے تو رفتن نتواں

پہلے مصرع میں رے مفتوح اور دوسرے مصرع میں مضموم۔ باقی اشعار میں گفتن و سفتن وغیرہ قافیے ہیں۔ اُستاد دو مصرعوں میں حرکت ماقبل روی مختلف لایا۔ اگر مَیں نے پچاس شعر کے قصیدے میں ایک شعر ایسا لکھا، تو کیا غضب ہُوا؟ آیا معترض صاحب استناد بمثل و نظیر کو نہیں جانتے اور نہیں مانتے؟ یہ دستور میرا نکالا ہُوا نہیں، قدیم سے ہے۔

بندہ نواز مَیں نے لکھا کہ "مؤید برہان" میرے پاس آگئی ہے اور مَیں اُس کے اعتراضات کے جواب بہ نشان صفحہ و سطر ایک تختہ کاغذ پر لکھ رہا ہوں۔ بعد اتمام نگارش تمھارے پاس اس مراد سے بھیجوں گا کہ تم ازراہ عنایت "مؤید" کا جواب لکھو۔ میری نگارش جو پسند آئے اس کو بھی جابجا درج کر دو۔ تم نے اس درخواست کا جواب ہاں، نا، کچھ نہ لکھا[1]۔ اب عنایت فرما کر ان تینوں باتوں کا جواب لکھیے اور ضرور لکھیے۔ میاں محمد میراں کو دعا۔

۱۸۔ مارچ ۱۸۶۷ء

(۱۵)

منشی صاحب، الطاف نشان سعادت و اقبال توامان، منشی حبیب اللہ خان کو غالب سوختہ اختر کی دُعا پہنچے۔ تمھارا خط پہنچا۔ پڑھ کر دل خوش ہُوا۔ تم میری بات پوچھتے ہو، لیکن مَیں کیا لکھوں؟ انگلیاں لکھنے میں نہیں۔ ایک آنکھ کی بینائی زائل۔ جب کوئی دوست آ جاتا ہے، تو اس خط کا جواب لکھوا دیتا ہوں۔ مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی کسی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے، مُوتے کی روح کو اس کی بُو پہنچتی ہے۔ ایسے ہی مَیں سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدار غذا کی تولوں پر منحصر تھی، اب ماشوں

[1] ملاحظہ ہو خط ۱۳ جو ۱۴۔ مارچ کو لکھا گیا تھا۔ معلوم نہیں چار دن کے اندر اندر اثبات یا نفی میں جواب کی امید کیوں پیدا ہوئی؟

پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی، اب دنوں پر ہے۔ بھائی اس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے۔ بالکل میرا یہی حال ہے۔ انّا للہ و انا الیہ راجعون

دوم شوال ۱۲۸۴ھ مطابق ۲۷ جنوری ۱۸۶۸ء   اپنی مرگ کا طالب غالب

چودھری عبدالغفور سرور

سرور مارہرہ ضلع ایٹہ کے رئیس اور قوم کے کمبوہ تھے۔ میرزا عسکری نے لکھا ہے کہ ان کے اجداد شہاب الدین محمد غوری کے عہد میں مارہرہ میں مقیم ہو گئے تھے اور انھیں لوگوں نے حضرت صاحب عالم مارہروی کے بزرگوں کو مارہرہ میں بلاکر عزت سے رکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ سرور فارسی بہت اچھی جانتے تھے اور صرف فارسی میں شعر کہتے تھے۔ سرور نے انشائے بہارستان لکھی تو غالب سے تاریخ کی فرمایش کی جس کا ذکر میرزا کے خط میں بھی آیا ہے لکھتے ہیں: وعدہ نہیں کرتا بے وعدہ پہنچے گا تو زیادہ لطف آئے گا:

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے   وہ گدا جس کو نہ ہو خوے سوال اچھا ہے

سرور نے میرزا کے اردو خطوط جمع کر لیے تھے اور خود ان پر ایک مقدمہ لکھا تھا جس میں فرماتے ہیں:

جب کلام بلاغت نظام رشک صائب، فخر طالب، جناب اسداللہ خاں صاحب غالب کا دیکھا۔ دل کو بھایا، یکتا پایا۔ ترسیل مراسلات میں قدم بڑھایا۔ ہر کتابت کا جواب آیا۔ سبحان اللہ! وہ زبان کہاں پاؤں کہ ان کے خُلق کا بیان لب پر لاؤں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی جواب مراسلہ میں تساہل و درنگ اور اصلاح شعر و عبارت میں دریغ اور ننگ نہ فرمایا۔ جو نامہ کہ بہ نام میرے

بہ عبارت اُردو تحریر کیا۔ مکتوب سادہ رویوں سے دلربا تر اور ہر سطر اُس کی سلسلہ مویوں سے تاب فرسا تر ہے۔ ...... پس تنہا متلذذ ہونا اور آپ ہی مزا اٹھانا خلافِ انصاف جانا۔ دل مائل تمام بہ شہرت عام ہُوا۔"

پھر لکھتے ہیں کہ اس اثنا میں ممتاز علی خاں صاحب میرٹھی مارہرہ آئے۔ انھوں نے انطباع خطوط کا بیڑا اُٹھایا، مَیں نے خطوط مرتب کر دیئے:

"چونکہ محبت جناب غالبؔ میرے حال پر بہت غالب ہے لہٰذا نام اس انشا کا "مہر غالبؔ" بہ کسر میم مناسب ہے۔ سال ختم تالیف بھی اس نام سے ...... پایا۔ طبیعت اور بڑھی۔ تحریر تاریخ کو دست و قلم بڑھایا:

انشا مملو بہ صد مطالب لکھی   یعنی پئے دوستان طالب لکھی
موسوم کیا جو "مہر غالب" سے سرورؔ   تاریخ بھی اس کی مہر غالب لکھی

گویا یہ مجموعہ ۱۲۷۸ھ میں مرتب ہُوا۔ لیکن اس کے چھپنے میں دیر ہوتی رہی۔ اس لیے کہ اور خطوط جمع کرنے کا خیال ہو گیا تھا۔ اور خواجہ غلام غوث بیخبرؔ اس کام کے مہتمم بن گئے تھے۔ آخر یہ مجموعہ عود ہندی کے نام سے غالب کی وفات سے صرف چار ماہ پیشتر چھپا۔ جس کا ابتدائی حصہ سرورؔ کے مکاتیب پر مشتمل ہے۔ سُنا ہے کہ سرورؔ کا انتقال بیسویں صدی کے اوائل میں ہُوا۔

(۱)

میرے کرم فرما، میرے شفیق:

شرط اسلام بود ورزش ایماں بالغیب   اے تو غائب زنظر مہر تو ایمان من است

آپ کے اس خط کا جواب بعد لکھنے اس شعر کے منحصر التماس پر ہے کہ میری طرف سے تحریرِ جوابِ خط میں کبھی تقصیر نہ ہو گی۔ لیکن اغلب و اکثر ابتدا بہ تحریر نہ ہو گی۔ یہ خط ناچار از روئے اضطرار واپس بھیجتا ہوں، واسطے خدا کے میرے پیر و مرشد[1] کے ارشادات

---

[1] صاحب عالم مارہروی

کو ایک اور کاغذ پر اپنے ہاتھ سے نقل کر کے بھیج دیجیے تاکہ مجھ بدنصیب کو معلوم ہو کہ حضرت نے کیا لکھا ہے۔ جناب چودھری غلام رسول صاحب کی خدمت میں سلام نیاز۔ استاد شیخ عطا حسین صاحب کی جناب میں سلام۔

(۲)

بندہ پرور،

آپ کا تفقد نامہ محررہ ۱۵۔ نومبر آج پنجشنبہ کے دن ۱۸ نومبر کو یہاں پہنچا۔ مارہرے کا خط دلّی چوتھے دن آیا ہے، دلی کا خط مارہرے دیر میں کیوں پہنچتا ہے؟ لو، تمھاری خوشی، اب کے یہ خط بیرنگ بھیجتا ہوں[1]، مگر مجھ کو اطلاع دیجیے گا کہ کس دن پہنچا؟

۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنا شروع کی۔ جو سُنا گیا وہ بھی ضمیمۂ سرگزشت کرتا گیا۔ مگر بطریق لزوم مالایلزم اُس کا التزام کیا ہے کہ بزبان فارسی قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے، اس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسما کے، کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے۔ چنانچہ ایک نسخہ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ مگر یہ نذر ہے جناب قبلہ و کعبہ حضرت صاحب عالم صاحب کی اور چونکہ وہ آپ کے بزرگ ہیں، جرأت نہ کر سکا کہ آپ کی نذر کروں اور سپہر میں اُن کو مشترک رکھوں۔ نذر اُن کی ہے اور فیض یابی آپ کی مطالعہ سے۔

ہیہات یہ کاتب اساتذہ کے کلام کو کیا بگاڑ دیتے ہیں، گویا مسخ کر دیتے ہیں۔ اُن سے بعید نہیں، لیکن تم سے اور حضرت صاحب سے بعید ہے کہ سہو کاتب کا

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور نے خود کہا تھا کہ خط بیرنگ بھیجا کیجیے۔

نہ سمجھ لیا۔

من آں دریاے آشوبم کہ از تاثیر خاصیت

دو کافوں کا علی التواتر آنا دوسری بات ہے، "دریاے آشوب" کیا ٹکسال باہر لفظ ہے۔ استعارہ بالکنایہ صحیح، مگر یہ محل نہیں ہے۔ یہاں تو دریا چاہیے بے شائبہ استعارہ وکنایہ۔ عیاذاً باللہ! عرفی اگر ایک بڑا قدح بھنگ کا یا ایک بوتل شراب کی پیے ہوئے ہوتا، تو بھی یوں نہ لکھتا۔ اس غریب کا مصرع یوں ہے:

من آں دریا پُر آشوبم کہ از تاثیر خاصیت

"دریا" موصوف "پر آشوب" صفت، دوسرے مصرعے کا کاف صفت کی تعبیر۔ اب روے سخن حضرت صاحب عالم صاحب کی طرف ہے۔ امیدوار ہوں کہ میرے ہم عمر مرشد، میرے ہم فن مخدوم، میری تقصیر معاف کریں۔ اگرچہ تریسٹھ برس کی عمر میں بہرہ ہو گیا ہوں، پر بینائی میں فتور نہیں۔ عینک سے اعانت چاہی منظور نہیں۔ باوجود حدت بصر بسبب نقص فہم کے دستخطی عبارت مجھ سے پڑھی نہیں جاتی۔ نگے جو دوبار میں نے جواب لکھا ہے، صرف قرائن ملحوظ رکھے ہیں، ورنہ عبارت باستیفا مجھ سے نہیں پڑھی گئی۔ آخر چودھری صاحب تو آپ کے معتقدوں میں بمنزلہ عزیزوں کے ہیں۔ جو آپ فرمایا کریں، وہ انھیں الفاظ کو لکھ دیا کریں۔ اب سب عبارت کا جواب جب لکھوں گا کہ کتاب کی رسید اور اس مطلب کا اعادہ تحریر بدستخط چودھری صاحب میرے پاس آجائے گا۔

۱۸۔ نومبر ۱۸۵۸ء

(۳)

جناب چودھری صاحب،

آپ کا عنایت نامہ اس وقت پہنچا اور یہ وقت صبح کا ہے، دن بدھ کا، ۱۷ شوال

کی چوبیسویں ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ اور دسمبر کی پہلی ۱۸۵۸ء۔ کتاب کے پارسل کی رسید معلوم ہوئی۔ حکیم عبدالرحیم خاں کوئی نامی اور نامور نہیں ہیں، یہاں کے قاضی زادوں میں سے ایک شخص ہیں، طبابت کرنے لگے ہیں۔ میرے بھی آشنا ہیں۔ صرف سلام علیک، زیادہ ربط نہیں ہے۔ سوا اُن کا حال مجھ کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ آگے حضرت صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ جو کچھ لکھیں وہ بقلم چودھری صاحب لکھا جائے۔ حضرت نے نہ مانا اور پھر عبارت بدستخط خاص لکھی۔ واللہ باللہ نہ مجھ سے نہ اور کسی سے پڑھی گئی۔ ناچار ان کا خط پھر آپ کو بھیجتا ہوں۔ حضرت سے کچھ نہ فرمایئے گا، مگر اس عبارت کو اپنے ہاتھ سے نقل کر کے مجھ کو بھجوایئے گا ضرور اور جلد۔ شفیق مکرم جناب چودھری غلام رسول صاحب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

یکم دسمبر ۱۸۵۸ء

(۴)

چودھری صاحب شفیق مکرم کی خدمت میں بعد ارسال سلام مسنون عرض کرتا ہوں کہ آپ نے ذرہ پروری اور درویش نوازی کی، ورنہ میں سزاوار ستایش نہیں ہوں۔ ایک سپاہی زادہ ہیچمداں اور پھر دل افسردہ و ہمداں فسردہ۔ ہاں، ایک طبع موزوں اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی کی ترکیبِ الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کے پرداز میں میرا قول اکثر خلاف جمہور پایئے گا اور حق بجانب میرے ہوگا۔ پہلے میں حضرت سے پوچھتا ہوں کہ یہ صاحب جو شرحیں لکھتے ہیں، کیا یہ سب ایزدی سروش[1] ہیں اور ان کا کلام وحی ہے؟ اپنے اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ ہر جگہ ان کا قیاس غلط ہے، مگر یہ بھی نہیں کوئی کہہ سکتا کہ جو کچھ یہ فرماتے ہیں، وہ صحیح ہے۔

اسی چھاپے میں آپ جس کا حوالہ دیتے ہیں:

---

[1] خدائی فرشتے

منکہ باشم عقل کل[1] الخ

اس شعر کی شرح کو ملاحظہ کیجیے۔ عبارت وہ تعقید سے لبریز کہ مقصود شارح کا سمجھا بھی نہیں جاتا اور جب غور و تامل کے بعد سمجھ لیجیے تو وہ معنی ہرگز لائق اس کے نہیں ہیں کہ فکر سلیم اس کو قبول کرے۔ پھر:

"احسان تو بشگافتہ" الخ[2]

اس مصرع کی توجیہ کتنی بے مزہ اور بے نفع ہے؟ عرفی کو کہاں سے لاؤں جو اس سے پوچھوں کہ بھائی تو نے اس شعر کے کیا معنی رکھے ہیں[3]؟ قصہ کوتاہ:

دیواں گری محبت تو — کامروز مسلم ست ما را

بیگانہ ز تاج کرد تارک — آوارہ ز کفش کرد پا را

جیسا کہ دوسرے شعر کے مفہوم کو شارح کہتا ہے کہ "دیوانگی" میں یہ حالت بعید نہیں، ایسا ہی اگر کوئی کہے منصب "دیوانی" سے یہ بات بعید ہے، تو پھر شارح کیا جواب دے گا؟ ہاں یہ کہے گا کہ غلبۂ محبت میں پاس وضع نہ رہا اور دیوان جی صاحب کچہری سے ننگے سر اور ننگے پاؤں نکل بھاگے۔ ہم نے مانا، مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ "دیوانگی" کیوں نہ لکھیں کہ دوسرے شعر کے معنی بے تکلف منطبق ہو جائیں اور توجیہات درمیان نہ آئیں؟ فقیر کے نزدیک "دیوانگی محبت" تو صحیح اور بے تکلف ہے اور "دیوانگی و محبت" تو غلط محض اور "دیوانگری محبت" تو تکلف محض۔ دیوانگی اور محبت دو صفتیں کیوں جمع

---

[1] عرفی کا شعر ہے:

منکہ باشم عقل کل را ناوک انداز ادب

مرغ اوصاف تو از اوج بیاں انداختہ

[2] عرفی کا مصرع ہے:

احسان تو بشگافتہ ہر قطرۂ میم را

کریں؟ غور کیجیے، عطف داو یہ چاہتا ہے کہ یہ شخص پہلے سے دیوانہ تھا اور پھر اسی حالت میں اس کو محبت پیدا ہوئی۔ دیوانگی میں تاج و کفش بے جا تھے، محبت پیدا ہونے کے بعد یہ حالت طاری ہوئی؟ کیا بے مزہ توجیہ ہے۔ ہاں "دیوانگی محبت" یعنی وہ جنوں جو فرطِ محبت میں بہم پہنچا، اس نے اس احوال کو پہنچایا۔ فقیر "دیوانگی محبت" کہے گا۔ اور "دیوانگی و محبت" کہنے کو منع کرے گا اور "دایوانگری محبت" کہنے کو نہ مانع آئے گا، نہ تسلیم کرے گا۔ زیادہ اس سے کیا عرض کروں۔ یاد آوری اور مہرگستری کا شکر بجا لاتا ہوں اور بس۔

اب یہاں سے روئے سخن حضرت پیر و مرشد صاحب عالم صاحب کی طرف ہے۔ اپنے مخدوم و مطاع حضرت صاحب کی خدمت میں بندگی عرض کرتا ہوں اور حیران ہوں کہ اور کیا کہوں۔ یہ مدعا چودھری صاحب کی تحریر سے معلوم ہو گیا تھا۔ اس کا جواب لکھا گیا۔ حضرت کے دستخط خاص کی لکھی ہوئی عبارت سے جو سمجھتا ہوں اس کا جواب لکھتا ہوں اور جو مجھ سے نہیں پڑھا گیا وہ تعویذ بازو کر رکھتا ہوں۔ اگر بفرض محال کبھی ملاقات ہو گی تو آپ سے دریافت کر کے پاسخ گزار ہوں گا۔ ہاں حضرت، سچ ہے میر امین حسن خاں میرے دوست ہیں اور مرزا عباس میرا بھانجا۔ فتنہ و فساد کے زمانے میں بلگرام میں رہا، اب وہ فرخ آباد میں ڈپٹی کلکٹر ہے۔ آپ کی اور بھائی منشی نبی بخش صاحب کی ملاقات سے میرا دل بہت خوش ہوا۔ یاد رہے سخن فہمی اس بندگا کا حق ہے۔ اب آگرے میں بے کار اور پنشن کے امیدوار ہیں۔ ع

تا ہر چہ گفتی از تو مکرر شنودمے

شدے کی رعایت سے کہ وہ بیائے مجہول ہے بمعنی "میشد" اکثر صاحب گفتی کو بھی بیائے مجہول پڑھتے ہیں، تاکہ میگفت کے معنی پیدا ہوں۔ اس صورت میں خطاب

---

[1] مطلب یہ ہے کہ عرفی نے "دیوان گری محبت" نہیں بلکہ "دیوانگی محبت" لکھا تھا۔

سے بطرف غیب کے رجوع کرتے ہیں۔ اور "گفتی" بیاے معروف سے صیغۂ واحد حاضر ہے، ازمنہ میں سے اشعار زمانۂ ماضی رکھتا ہے۔ اور "شدن" "شود" یہ سب استقبال کے مقتضی ہیں اور معروف گفتی ماضی ہے۔ پس اگر "گفتی" بیاے معروف کہیے تو اُوپر کے مصرعے میں بُدے کہنا ہوگا، بودے کا مخفف۔ خلاصہ یہ کہ اگر وہاں بدے کہیے تو یہاں گفتی بیاے معروف بے تکلف درست اور بیاے مجہول غلط ہے اور اگر وہاں "شدے" کہیے تو یہاں گفتے بیاے مجہول کہیے۔ غیبت اور خطاب کا تفرقہ مٹا دیجیے۔ گفتے بیاے مجہول میں خطاب حاضر مقرر رہتا ہے اور تو کا لفظ جو قریب ہے وہ اس معنی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ نظائر اس کے فارسی میں بہت ہیں۔ رباعی کے باب کی پرسش ہرگز نہ رہے، نہیں کہی زیادہ حد ادب۔

۱۸۵۹ء

(۵)

بندہ پرور،

مہربانی نامہ آیا، سر پر رکھا آنکھوں سے لگایا۔ فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے، پھر تتبع کلام اہل زبان، لیکن نہ اشعار قتیل و واقف و شعراے ہندوستان کہ یہ اشعار سواے اس کے کہ ان کی موزونی طبع کا نتیجہ کہیے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی، نہ معنی نازک۔ ہاں الفاظ فرسودۂ عامیانہ جو اطفال دبستاں جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں درج کرتے ہیں، وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں۔ جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور ان کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور اُن کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے، تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔

"منکہ باشم"[۱] اس کی جو شرح چھاپے میں لکھی ہے اُس کو ملاحظہ کیجیے اور معنی میرے خاطر نشان کیجیے تو میں سلام کروں۔

پہلے نظر یہاں لڑنی چاہیے کہ "از اوجِ بیان انداختہ" کا فاعل کون ہے اور مفعول کون ہے؟ اگر "عقلِ کل" کو "انداختہ" کا مفعول اور "منکہ" کے کاف کو کدامیہ ٹھہراؤ گے تو بے شبہہ "انداختہ" کے فاعل دو ٹھہریں گے: ایک "ناوک انداز ادب" اور ایک "مرغِ اوصافِ" تو۔ ایک فعل اور دو فاعل، یہ کیا طریق اور کیسی تحقیق ہے؟

اب فقیر سے اس کے معنی سُنیے: "من" انداختہ کا مفعول، "را" مقدر، "منکہ" کا کاف توصیفی، "ناوک انداز ادب" "ادب آموز" یعنی اُستاد، "مرغِ اوصافِ تو" فاعل (یعنی) مجھ کو کہ عقل کل کا اُستاد ہوں، تیرے مرغ اوصاف نے اوج بیان سے گرادیا۔ عقل کل تک کہ وہ علویوں میں اعلیٰ ہے، اس کا ناوک پہنچ سکتا تھا، مگر مرغِ اوصاف اس مقام پر ہے کہ جہاں اس ناوک انداز کو پہنچانے کی گنجایش نہیں۔ اوج بیان سے گرنا عاجز آنا ہے۔ قدرت وہ کہ عقل کل سے بھی زیادہ اور عجز یہ کہ اوج بیان سے گرگیا۔ اچھا مبالغہ ہے "مرغ اوصاف کی بلندی کا" اور کیا خوب مضمون ہے اظہارِ عجز کا باوجود دعوائے قدرت:

ایثار تو بر دوختہ چشم و دہن آز

اس کے تو معنی وہی ہیں جو چھاپے میں لکھے ہیں۔ مصرع ثانی کی شرح میں گمراہ ہو گیا:

احسانِ تو بشگافتہ ہر قطرۂ یم را

---

[۱] عرفی کا شعر پہلے بھی نقل ہو چکا ہے۔ یہاں چونکہ اس کی شرح لکھی ہے اس لیے دوبارہ نقل کیا جاتا ہے:

منکہ باشم عقلِ کل را ناوک اندازِ ادب

مرغ اوصافِ تو از اوجِ بیاں انداختہ

یعنی احسان تو ہر قطرہ دریا بشگافت تا ہم بقید حساب نیامد۔ یہ ہیچمدان اس معنی کے معنی نہیں سمجھا۔ سیدھی بات ہے مگر خیال میں جب آئے گی کہ اساتذہ کے مسلمات معلوم ہوں۔ کمال ایثار و عطا میں مروارید و یاقوت و بحر و معدن کی کم بختی آتی ہے۔ لعل و دُر کا معدوم ہو جانا، اور بحر و کاں کا خالی رہ جانا، نئی نئی طرح سے باندھا ہے۔ چنانچہ مَیں نے کسی زمانے میں اسی زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر وزیر الدولہ والیِ ٹونک کو بھیجا تھا اُس میں کے دو شعر آپ کو لکھتا ہوں:

ناموس نگہ داشتی از جود بگیتی　　جز پردگیان حرم معدن ویم را
وقت است کہ ایں قوم بہ ہر کوچہ و بازار　　پرسند ز ہم منشاء رسوائی ہم را

"پردگیان حرم معدن ویم" یعنی لعل و گوہر جو کثرتِ ایثار سے کوچہ و بازار میں خاک آلودہ پڑے ہُوئے ہیں، وہ باہمدگر دردمندانہ یہ گفتگو کرتے ہیں کہ اس شخص نے سب کی حرمتیں رکھ لیں اور سب کی آبروئیں بچائیں۔ ہم کو اس قدر بے حرمت اور ذلیل کیوں رکھا ہے؟

قطرۂ دریا کا حساب کے واسطے چیرنا بے حساب ہے۔ مقولہ عرفی کا یہ ہے کہ جتنے موتی دریا میں ہاتھ آئے وہ بخش دیئے اور بخشش کا ذوق باقی رہا۔ چونکہ قطرہ میں بالقوہ استعداد موتی ہو جانے کی ہے، تو اس احتمال سے ہر قطرۂ دریا کو چیر ڈالا کہ اگر موتی ہاتھ آویں تو وہ سائلوں کو دیے جاویں۔ پہلے مصرع میں حرص کا سیر کر دینا موافق مسلماتِ شعر ممتنع اور اس کا مرفوع میں آنا اغراق، دوسرے مصرع میں بہ احتمال استعداد بالقوہ قطرے کو چیر ڈالنا اور پھر اس طرح کہ ہر قطرے کو۔ یہ اغراق سے گزر کر تبلیغ و غلو ہے۔

یہاں سے خطاب حضرت صاحب عالم کی طرف ہے۔ مخدوم مکرم و مطاع معظم قبلۂ دیدہ و دل کہ جو میرے اور اپنے ملنے کو از قسم فرضِ محال نہیں مانتے ہیں، خدا کرے

ایسا ہی ہو، جیسا وہ جانتے ہیں۔ تقصیر معاف ہو اگرچہ دنیا میں ظہور ہر امر بحسب مساعدت اسباب ہے، تو اس تمنا کا حصول مانند اعادہ شباب ہے۔[1] کوئی وجہ نہیں پاتا آپ کے یہاں تشریف لانے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی میرے وہاں آنے کی۔ اگرچہ حیز امکان سے باہر نہیں مگر وقوع میں تامل ہے۔ اب جو بھائی منشی نبی بخش صاحب کو خط لکھوں گا تو آپ کا سلام ضرور لکھ دوں گا۔ آپ نے احباب بعاض کی خیر و عافیت عموماً لکھی، بالتخصیص حضرت شاہ عالم صاحب کا سلام نہ لکھا۔ کیا وہ وہاں نہیں ہیں اور اگر اور کہیں ہیں تو ان کا حال مجھ کو لکھیے اور اگر وہاں ہیں تو میرا سلام اُن کو کہیے۔

رباعی کے باب میں بیان مختصر یہ ہے کہ اُس کا ایک وزن معین ہے۔ عرب میں دستور نہ تھا سوائے عجم کے۔ یہ بحر ہزج میں سے نکالا ہے۔ "مفعول مفاعلن فعولن" ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور، اس وزن پر فعلن بڑھا دیا ہے، "مفعول مفاعلن فعولن فعلن" زحافات اس میں بعض کے نزدیک اٹھارہ اور بعض کے نزدیک چوبیس ہیں اور وہ سب جائز اور روا ہیں اور اس بحر کا نام "بحر رباعی" ہے۔ رباعی سچ ہے کہ سوائے اس بحر کے اور بحر میں نہیں کہی جاتی اور یہ جو مطلع اور حسن مطلع کو رباعی کہتے ہیں، اس راہ سے ہے کہ مصرعے چار ہیں۔ ورنہ رباعی نہیں ہے، نظم ہے۔ قدما کو بیشتر اس کا التزام تھا، کہ ہر مصرع میں قافیہ رکھتے تھے خاقانی برعایت صنعت ذو قافیتین کہتا ہے:

من بودم و آں نگار روحانی روے — انگندہ دراں دو زلف چوگانی گوے
خلقے بدر ایستادہ خاقانی جوے — من در حرم وصال "سبحانی گوے"

میں پانچ سات برس سے بہرا ہو گیا ہوں۔ ایک رباعی چار قافیہ کی اس مضمون خاص کی میں نے لکھی ہے، بے رعایت صنعت ذو قافیتین:

---

[1] یعنی محال ہے، جیسے کہ جوانی واپس نہیں آسکتی۔

دارم دلِ شاد و دیدۂ بینائے   وز کرّ ی گوشم نبود پروائے
خوب است کہ نشنوم ز ہر خود رائے   گلبانگ "انا ربکم الاعلائے"

فقیر اس باب میں متعصب ہے۔ اور وزن کی دو بیت میں قافیہ والی کو رباعی نہ کہے گا۔

نثر عاری، نہ قافیہ نہ وزن، نثر مسجع، قافیہ موجود، وزن مفقود۔ مگر اس میں ترجیع کی رعایت ضرور ہے یعنی فقرے میں کے الفاظ مماثل اور ملائم ہمدگر ہوں اور اگر یہ بات نہ ہوگی اور صرف قافیہ ہوگا تو اس کو مقفےٰ کہیں گے، نہ مسجع۔ نثر مرجز وہ ہے کہ وزن ہو اور قافیہ نہ ہو۔ جب آپ لالہ قتیلؔ کے گھڑے ہوئے فقرے دیکھ چکے ہیں تو مجھ کو فقرہ تراشی کی تکلیف کیوں دیتے ہیں؟ زمانۂ گزشتہ میں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نیرؔ تخلص ایک مختصر سا دیوان حضرتِ نظامیؔ کا مجھ کو دکھلانے لائے تھے، اُس میں نثر مرجز تھی۔ مَیں اُس دن نواب مصطفےٰ خاں حسرتیؔ و شیفتہؔ کو خط لکھا چاہتا تھا۔ اسی وضع پر خط لکھا اور وہ خط پنج آہنگ میں ہے۔ مگر میں نے اس طرز میں بمقتضائے شوخیِ طبع یہ بات کی ہے کہ ایک جگہ جو فقرے مقفےٰ ہو گئے ہیں اور وہ لفظ مجھ کو پسند آئے ہیں، مَیں نے اُن کو یوں ہی رہنے دیا ہے۔ اس کو دستور میں تصوّر نہ کیجیے گا۔ وہ رقعہ یہ ہے:

ہاں خواجۂ بے پروا، من بندہ کہ غمناکم وز غصہ جگر چاکم، خواہم سخنے گفتن آں لعبتِ آں ناز کہ مے رفتند، آں نامہ فرستادند، کز دیدن آں خوں شد، دل تا جگر از اندہ، گفتم چکنم غالبؔ، چوں کار دگرگوں شد۔ می بایدم اینک رفت تا عذرِ سخن خواہم، چوں گرد و غبارے بود، رفتن نتوانستم۔ آں روز بشام آمد، لابلکہ سیہ تر شد، سر ماندہ ببالین بر چوں غم زدگان خفتم۔ ہے ہے چہ تواند خفت۔ آں خستہ کہ غمخوارش، بر زخم نمک ریزد، وز دیدۂ بیدارش، شورابہ رواں باشد۔ چوں از افقِ شرقی، خورشیدِ درخشندہ، ناگاہ سرے بر زد، آتش بجہاں در زد، مرغ سحری پر زد، رفتم بجگر کاوی واں رازِ نہانی را از دل بہ زباں دادم، وز صورت

تنہائی، بے پردہ چو ہمرازاں، نے آمد[1] ہمدم شد، چندانکہ دم اندر نے از مہر دمیدم من چوں من بنوا آمد، نہ آں نالہ کہ برلب بود، از باطن نے سر زد، آں دم کہ نفس با نے، زینگونہ کشاکش کرد، یک کاغذ ننوشتہ، بود است بدستم در، چوں نالہ نمودے داشت، زآں شعلہ کہ دودے داشت، بر صفحہ نشانہا ماند، گفتم مگر ایں صفحۂ غمنامۂ رازیستے، فہرست نیازیستے، باید کہ فرو پیچم، وانگہ بہ نشانمندی، زی خواجہ رواں سازم، کوتاہ کنم گفتن، آں نامہ کہ من گفتم، حجاب در وا، بر دند درواں بہ دند۔ ہر چند در اندیشہ پیداست کہ خوش باشد، با خواجگی استغنا با اینہمہ خوش نبود، پوزش نہ پذیرفتن، امروز سحرگاہاں، روشن گہر آں تیر کش روح رواں دانم، بل خوشتر ازاں دانم، دیوان نظامی را آورد بسوے من، زینگونہ نوا با بود، در پردۂ گفتارش، کز ذوق بہ نجارش، ایں زمزمہ سر کردم، والا گہر اکبر خاں، خوانند سلام از من۔

(۶)

جناب چودھری صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں اور شکریہ احسان بجالاتا ہوں۔ "حاشا" اور "حاش للہ" کے جواب کو حوالہ ان سطور پر رکھتا ہوں کہ جواب جناب حضرت صاحب کے ارشاد کے جواب میں لکھوں گا۔ آپ کو اتنا لکھنا اور کافی ہے کہ اپنے عم والا قدر جناب چودھری غلام رسول صاحب کو فقیر کا سلام نیازانہ پہنچائیے اور جناب شیخ عطا حسین صاحب عطا کو بھی سلام کہیے۔

اب خطاب جناب حضرت عالم صاحب کی طرف ہے۔ پیرو مرشد قلم کا کام زبان سے لینا یعنی تحریر کے مطالب کو پڑھنا اور بڑھا دینا آسان ہے اور زبان کا کام قلم سے لینا دشوار ہے۔ یعنی جو کچھ کہنا چاہیے اس کو کیوں کر لکھنا چاہیے۔ وہ

---

[1] یہاں نے سے مراد غالباً حصہ ہے۔

بات کہاں کہ کچھ مَیں نے عرض کیا کچھ آپ نے فرمایا، دو چار باتوں میں جھگڑے نے انجام پایا۔ خیر دولت ہمزبانی کہاں میسّر؟

آپ کا حکم بجالانے کو اپنا شرف جانتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ نظامی اب ایسا ہُوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری دِوالی سنگھ ثم متخلص بہ قتیل جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے اس کی تصدیق نہ کرے، تب تک اس کا کلام قابل استناد نہ ہو؟ قتیل اساتذۂ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں۔ اُس کے علم فارسی کا ماخذ اُن لوگوں کی تقریر ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہُوئے، بیشتر سادِ کشمیری یا کابلی و قندھاری و کرمانی۔ احیاناً کوئی عامہ اہل ایران میں سے ہوگا، مانا کہ عظماے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا۔

تقریر اور ہے، تحریر اور ہے اگر تقریر بعینہٖ تحریر میں آیا کرے، تو خواجہ بقراط سے اول شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید سے یہ سب نثریں کیوں خونِ جگر کھایا کرتے؟ وہ سب طرح کی نثریں جو لالہ دِوالی سنگھ قتیل متوفی نے بتقلید اہل ایران لکھی ہیں، نہ رقم فرمایا کرتے؟

یہ شخص مدعی ہے کہ "کدہ" کا لفظ سوائے پانچ چار اسم کے اور اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا۔ پس آرزو کدہ اور دیوکدہ اور نشتر کدہ اور امثال اس کے جو ہر جگہ اہلِ زبان کے کلام میں آیا ہے وہ نادرست ہے۔ مَیں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھے جائیں اور جو مَیں عرض کروں اس پر حضرت غور فرمائیں، تب معلوم ہو کہ یہ کتنا لغو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے۔

آمدم بر سرِ مدعا۔ نثر "مرجز" اس کو کہتے ہیں کہ وزن ہو اور قافیہ نہ ہو، مقابل مقفّیٰ کے کہ قافیہ ہو اور وزن نہ ہو۔ اور یہاں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ وزن میں قید منظور نہیں

مثلاً حضرت نظامی علیہ الرحمۃ کی نثر کا وزن یہ ہے مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن۔
حضرت ظہوری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

رائتیش سروِ بن گلشن فتح، خنجرش ماہی دریاے ظفر،

یہ نثر مرجز ہے وزن اس کا "فعلاتن فعلاتن فعلن"۔ کاتبوں نے مقفےٰ کرنے کے واسطے صورت بدل دی ہے اور وہ تصرف کیا ہے کہ نثر نہ مرجز رہی، نہ مقفےٰ۔ چنانچہ اساتذۂ فن: لن تنالوا البرحتی تنفقوا، اس آیت سراسر ہدایت اثر کو نثر مرجز کہتے ہیں اور اس کا وزن یہ ہے "فاعلاتن فاعلاتن فاعلن"۔ "ویرزقہ من حیث لا یحتسب" اس کا وزن "فعولن فعولن فعولن فعول"۔ بندہ کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم پر ہے، مقفی: قافیہ ہے اور وزن نہیں، مرجز: وزن ہے اور قافیہ نہیں، عاری: نہ وزن ہے نہ قافیہ۔ مسجع ہی مقفےٰ ہے کہ دونوں فقروں میں الفاظ ملائم اور مناسب ہمدگر ہوں۔ نظم میں یہ صنعت آپڑے تو اس کو مرصع کہتے ہیں۔ اور نثر اس صنعت پر مشتمل ہو تو اُس کو مسجع کہتے ہیں۔ اس قاعدہ کو عبدالرزاق بدل سکتا ہے نہ صاحب قلزم ہفتگانہ، نہ یہ قطرۂ بے سروپا[1]

"حاشا" و "حاش للہ" کلام اہل عرب میں اسی طرح ہے، جس طرح آپ فرماتے ہیں، مگر پارسیوں نے ازداو تصرف بمعنی زنہار قرار دیا ہے یعنی تاکید اگر نفی پر آئے تو نفی کی تاکید اور مثبت پر آئے تو اثبات کی تاکید۔ مَیں کسی کلمہ کا استعمال نہیں کرتا، جب تک اہلِ زبان کے کلام میں نہیں دیکھتا۔ عیشی بے چارہ اُس کے لائق نہیں کہ مستند علیہ بنے، مگر یہ لفظ غلط نہیں لکھا ہے اُس غریب نے۔

حضرت قبلہ فارسیوں کے تصرفات اگر دیکھیے تو حیران رہ جائیے۔ مجھ کو اس وقت کہاں یاد ہے اور کتاب کیا نام کوئی ورق بھی لکھا ہوا میرے پاس نہیں حاشا

---

[1] قطرۂ بے سروپا صاحب قلزم ہفت گانہ (یعنی ہفت قلزم) کی رعایت سے کہا اور خوب کہا۔

کا کوئی شعر موکد نفی اگر یاد آجائے گا تو آپ کو لکھا جائے گا:

ہرزہ مشتاب وپے جادہ شناسان بردآ

اے کہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

یہ مثنوی جس میں یہ مصرع ہے:

"حاشَ للہ" کہ بد نمیگویم

کلکتہ میں مَیں نے لکھی تھی۔ پانچ ہزار آدمی فراہم تھے اور جو اعتراض مجھ پر کیے تھے اُس میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ "ہمہ عالم" غلط ہے، یعنی "ہمہ" کا لفظ "عالم" کے لفظ کے ساتھ ربط نہیں پا سکتا۔ قتیل کا حکم یوں ہے۔ عرض کیا گیا کہ حافظ کہتا ہے:

"ہمہ عالم" گواہ عصمت اوست

سعدی کہتا ہے:

عاشقم "بر ہمہ عالم" کہ "ہمہ عالم" ازوست

غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ مثنوی وہاں لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رام پوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال اور نظائر کے پاس بھیجی گئی۔ اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کھال ادھیڑ ڈالتے۔ اب ایک نسخہ ہے "ابطالِ ضرورت" اگرچہ صاحب اس کا ہندی ہے بلکہ ہندو ہے مگر قابل اچھا ہے۔ دیکھیے اساتذہ کیا کیا تصرفات نمایاں کر گئے ہیں۔

مَیں نے آج تک اردو میں "انتظاری" بمعنے "انتظار" نہ آپ لکھا، نہ اپنے شاگردوں کو لکھنے دیا۔ اساتذۂ مسلم الثبوت کے ہاں فارسی میں موجود ہے۔ حاشا ایسا نہیں کہ اُن میں فارسی والوں کو تامل ہو۔ زیادہ حدِ ادب۔

۱۸۵۹ء

(۷)

جناب چودھری صاحب،

آپ کو بعد ابلاغ سلام آپ کے خط کے پہنچنے سے آگہی دیتا ہوں اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے کہ آپ کے چچا صاحب کے خط کا جواب اس سے آگے بھیج چکا ہوں۔ یں نہیں آسکا۔

یہاں پنسن کا مقدمہ پیش ہے۔ کبھی صاحب بہادر کمشنر بہادر کے پاس، کبھی صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس جانا ہوتا ہے۔ خود نہ جاؤں تو خیال رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت بلا بھیجیں یا کس وقت کوئی پرسش آجائے۔ بائیس مہینے سے وہ رزق کہ جو مقوم جسم اور مفرح روح تھا، مسدود ہے۔ کیا کھاؤں اور کیوں کر جیوں؟ للہ الحمد کہ گنہگار نہیں ٹھہرا۔ پنسن پاؤں گا، مگر وہ پنسن گورنمنٹ کے پولٹیکل سررشتہ سے مقرر کی ہوئی ہے۔ سو دہلی کا اجنٹی دفتر فرد فرد لٹ گیا، کوئی کاغذ باقی نہیں رہا۔ اب یہ شہر پنجاب احاطہ میں مل گیا۔ پنجاب کا نواب لفٹنٹ گورنر بہادر یہاں کا صدر ٹھہرا۔ اُس دفتر میں میری ریاست کا، میری معاش کا، میری عزّت کا نام و نشان نہیں ہے۔ ایسے ایسے پیچ پڑ گئے ہیں۔ کچھ نکل گئے ہیں، کچھ باقی رہے ہیں۔ یہ بھی نکل جائیں گے؛

کارہا آساں شود اما بہ صبر

یہاں سے روئے سخن صاحب عالم صاحب کی طرف ہے۔ جناب رفعت مآب مولائی و مرشدی تسلیم قبول کریں اور اُس تحریر سے، جواب میرے پاس بھیجی ہے، مجھ کو شاداں اور اپنے بخت اور قسمت پر ناز اں تصوّر فرمادیں۔ سب سمجھا اور سب مطالب کا جواب لکھتا ہوں۔ پہلے اپنا ایک شعر کمال گستاخی کو کار فرما کر لکھتا ہوں اور یہ نہیں لکھتا کہ یہ شعر مَیں نے کیوں لکھا ہے۔ شعر یہ ہے:

مرا بغیر ز یک جنس در شمار آورد　　　فغاں کہ نیست ز پروانہ فرق تا مگسش

بہ ہر حال حضرت کو یہ معلوم ہے کہ مَیں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صائبؔ و کلیمؔ و اسیرؔ و حزیںؔ کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا۔ جن لوگوں کے محقق ہونے پر اتفاق ہے جمہور کو ان کا حال کیا گزارش کروں۔

ایک اُن میں صاحب "برہان قاطع" ہے۔ اب ان دنوں میں "برہان قاطع" دیکھ رہا ہوں اور اس کے فہم کی غلطیاں نکال رہا ہوں۔ اگر زیست باقی ہے تو ان نکات کو جمع کر کے اس نسخہ کا نام "قاطع برہان" رکھوں گا:

کجا بود منزل کجا تاختم

شعر فردوسی میں "انگبین و شہد" اور شعر استاد میں "حرص و آز" واقعی بادی النظر میں زائد معلوم ہوتا ہے۔ "شیر ناب" بہتر ہے، لیکن "حرص و آز" کو کیا کیجیے گا؟ مَیں عرض کرتا ہوں کہ وہاں بھی "خشم و آز" ہے۔ ہرگز "حرص و آز" نہیں ہے۔ حکما اور صوفیہ قوت غضبی اور قوت شہوی کی تعدیل میں مختتیں کرتے ہیں۔ قوت غضبی کی اصلاح سے فضیلت شجاعت اور قوت شہوی کی اصلاح سے فضیلت عفت حاصل ہے اور یہ مسئلہ علم اخلاق میں مبرہن ہے۔ "دو دیدۂ من حرص و آز" بے معنے محض استاد کو بدنام کیا۔ ایک اسم سے دو مسمیٰ تراشے۔ واحد حقیقی کا تثنیہ اس سے علاوہ۔ مرد عارف حکیم نے قوّتِ شہوی کی اصلاح کا ذکر کیا اور قوّتِ غضبی کا مذکور بھی نہ کیا۔ میں نے خود "خشم و آز" دیکھا ہے اور یہی بجا ہے۔ "شہد" کی جگہ "شیر" اور "حرص" کی جگہ "خشم" درست، میری رائے آپ کی رائے کے مطابق۔ مگر گوگرد سُرخ اور پیل سفید میں ساکت ہوں۔ یہ تقریر کہ گوگردِ سُرخ کمیاب اور پیل سفید نایاب ہے، میرے

دلنشین نہ ہوئی۔ کبریت احمر اور کیمیا اور عنقا ان سب کا ایک حکم ہے۔ نظر اس قاعدے پر لعل سفید بہتر ہے اور کبریت احمر اور پیل سفید بے جوڑ ہے، جیسے امیر خسرو کی املیاں۔

ایک قاعدہ اور عرض کرتا ہوں "کم" کا لفظ اہل فارسی کے منطق میں کہیں افادۂ معنی سلب کلّی بھی کرتا ہے، جیسے "کم آزار" یعنی "نیازارندہ" نہ یہ کہ "کم آزارندہ" "کم ہمتا یعنی "بے ہمتا" بلکہ "اندک" کا لفظ بھی اس طرح آتا ہے جیسا کہ میرا خداوند نعمت نظامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتا ہے:

پس و پیش چوں آفتابم یکے ست   فروغم فراواں فریب اندکے ست

یعنی فریب بالکل نہیں نہ یہ کہ کچھ ہے۔ کمیاب اور نایاب ایک چیز ہے، نظامی نے "لعل سپید" کہا ہے کسی صاحب طبع نے اس کو غلط سمجھ کر "پیل سپید" بنا دیا ہے "انگبین" و "شہد ناب" شاید مثل غم و اندوہ و مسرت و فرحت ہو۔ یا نہ ہو شیر ناب ہی ہو، بلکہ شیر ناب بہتر ہے، لیکن حرص و آز تو کسی طرح درست نہیں۔ عارف کا دعویٰ ناقص اور لغو رہا جاتا ہے۔ اگر یہ قباحت لازم نہ آتی تو بھی ہم حرص و آز کو مسلّم نہ رکھتے، کس واسطے کہ غلام کا شبہہ بکمال وضوح غم و اندوہ و عدل و داد کا نظیر نہیں ہو سکتا ہاں انگبین و شہد کے جواز میں ہم مضائقہ نہ کریں گے مگر شیر ناب کو اُس سے اچھا سمجھیں گے شہد موے کی حلاوت کے واسطے اور شیر افزایش لطافت کے واسطے۔ "ماشا" و "حاش للہ" کا جواب آغاز تحریر میں لکھ چکا آپ کی اس نظیر لکھنے سے اُس کے جواز پر میرا یقین نہ بڑھا۔ "لو کشف الغطاء، لما ازددت یقیناً"۔

نثر مرجز کے باب میں پیر و مرشد کو اتنا تامل کیوں ہے؟ یہ جو نثریں آپ نے لکھی ہیں سوائے اُس نثر کے کہ جس کو آگے لکھوں گا، یہ تو سب مسجع ہیں۔ یعنی پہلے

فقرے کا ہر لفظ وزن میں موافق ہے دوسرے فقرے کے لفظ سے۔ نظم میں یہ صنعت آپڑے تو نظم کو مرصع کہیں گے اور نثر میں واقع ہو تو نثر کو مسجع کہیں گے۔ جو حضرت کہ اس نثر کو مرجز کہتے ہیں وہ نثر مسجع کی مثال ہم کو دیں۔ زنہار زنہار یہ نثر مرجز نہیں، مسجع ہے۔ ہاں یہ نثر مرجز ہے۔

صاحبا مشفقا شفیق دلی، زید الطافکم الی الابد، بعد تبلیغ بندگی و نیاز، برضمیر منیر روشن باد۔

اگر وہ نثر کہ جس کو میں نے مسجع کہا ہے، مرجز ہے تو اس کمبخت نثر کا کیا نام ہے؟ نہیں وہ مسجع ہے اور یہ مرجز ہے۔ میں تو بہت مختصر مفید لکھ چکا ہوں۔ آپ نہ مانیں تو کیا کروں؟ وزن نہ ہو قافیہ ہو، وہ مقفیٰ، وزن ہو قافیہ نہ ہو، وہ مرجز ہے۔ الفاظ فقرتین وزن میں برابر ہوں، وہ مسجع۔ اس صنعت کو بیشتر نثر مقفیٰ میں صرف کرتے ہیں اور چاہو قافیہ کا التزام نہ کرو۔ بہ ہر رنگ اقسام ثلثہ نثر یہی ہے۔ حضرت نے نثر مسجع کو مرجز کہا ہے۔ جواب وہی ہے کہ اگر مرجز یہ ہے تو مسجع کس نثر کو کہتے ہیں؟ اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم، نہ یارائے کلام۔

قتیل لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتبی رام پوری کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتمد سمجھے؟ بعد اتمام، خط کی تحریر کے خیال آیا کہ شاید کسی بات کا جواب رہ نہ گیا ہو۔

میں نے آپ کے خط کو دیکھا اور ایک بات دستور شگرف کی عبارت میں نظر آئی۔

"مرجز کلامیست منثور کہ وزن دارد سجع ندارد"

اس تعریف کو دیکھیے اور نمونہ نثر کو دیکھیے، وہ موزوں کہاں ہے "جو وزن دارد" اُس پر صادق آئے؟ وزن بمعنی تقطیع شعر مفقود۔ "سجع ندارد" خدا جانے یہ بزرگ

سجع کس کو کہتا ہے۔ سجع ہموزن ہونا دو لفظوں کا فقرتین میں یا مصرعین میں، سو اس نثر میں موجود ہے۔ موجود کو مفقود اور مفقود کو موجود لکھا ہے اور پھر کلام اس کا مقبول ہے۔

اللہ اللہ مُلّا غیاث الدین لکھتا ہے پس "مرجز نثرے باشد کہ کلمات فقرتین اکثر جاہا ہموزن باشد، در تقابل یک دیگر، بدوں رعایت سجع"۔ خدا کے واسطے سجع تو اسی کو کہتے ہیں کہ کلمات فقرتین یا مصرعین ہموزن یکدیگر ہوں، سو اس نثر میں موجود۔ "بدوں رعایت سجع" کے کیا معنے؟ مگر یہ دونوں صاحب وزن کو برابر ہونا کلمات کا سمجھتے ہیں اور سجع تقطیع شعر کو کہتے ہیں۔ اس عقیدے کی رکاکت اظہر من الشمس ہے صاحب دستور شگرف کا کلام نص اور مولوی غیاث الدین کا کلام حدیث نہیں ہے، آپ بھی غور فرمائیے اور انصاف کیجیے۔

فروری سنہ ۱۸۵۹ء

(۸)

شفیق مکرم مظہر لطف و کرم جناب چودھری صاحب کی خدمت میں بعد سلام یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ کا مہربانی نامہ آیا، میرا رنج و تشویش مٹا یا میری خدمت مقبول ہوئی۔ خوشی حصول ہوئی۔ میر امداد علی شاہ کو میری دعا کہنا، ان کا باپ میرا بڑا یار تھا۔ میری طرف سے خاطر جمع کر دیجیے گا۔ اب سبیل اچھی نکل آئی، چودھری صاحب کے ذریعہ سے جو کچھ مجھ کو بھیجنا ہوگا، بھجواؤں گا۔ جناب چودھری صاحب آج کا میرا خط کاسۂ گدائی ہے، یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں۔ تفصیل یہ کہ باقر علی۱ دہلوی کے مطبع میں سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا تھا، مسمّی بہ دہلی اُردو اخبار بعض اشخاص سنین ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر احیاناً آپ کے یا کسی آپ کے دوست کے ہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں، تو اکتوبر سنہ ۱۸۳۷ء

عـ۱ صحیح نام محمد باقر تھا۔ غالب یا تو سہواً غلط نام لکھ گئے یا ناقلوں نے باقر علی بنا دیا۔

سے دو چار مہینے کے آگے کے اوراق دیکھے جائیں۔ جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے دو سکّے ان کے نام کے کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو بے تکلف وہ اخبار چھاپے کا اصل بجنسہ میرے پاس بھیج دیجیے۔ آپ کو معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے ہیں اور ذوق نے اس مہینے کے بعد سکّے کہہ کر گزارنے ہیں۔ احتیاطاً پانچ مہینے تک کے اخبار دیکھ لیے جائیں۔ یہاں تک میری طرف سے ابرام ہے کہ اگر مثل کسی اور شہر میں کوئی آپ کا دوست جامع ہو اور آپ کو اُس پر علم ہو، تو وہاں سے منگوا بھیجیے۔ والسلام مع الاکرام

۱۸۵۹ء

(۹)

شفیق میرے، عنایت فرما میرے،

تمھاری مہربانی کا شکر بجا لاتا ہوں۔ نہایت سعی یہ تھی کہ آپ کی طرف سے ظہور میں آئی میں نے مہتمم مطبع "جام جہاں نما" کو لکھ بھیجا ہے اور ترکِ سعی کیا ہے۔ آپ بھی فکر نہ کیجیے۔ اگر کہیں سے آپ کے پاس آ جائے تو مجھ کو بھیج دیجیے، میرے پاس آئے گا تو میں تم کو اطلاع دے دوں گا۔

عنایت الٰہی کا کون شخص مشتاق نہ ہوگا؟ اس کی پرسش نامہ میں خدمت گزاری کو حاضر ہوں، وہ جب چاہیں اپنا کلام بھیج دیں۔ میرا سلام اور یہ پیام کہہ دیجیے گا۔

صاحب تم نے ہمارے پیر و مرشد کو ہم پر خفا کر دیا ہے۔ بھلا وہ خط نہ لکھیں، نہ لکھیں، کبھی تم کو فرماویں کہ غالب کو میری دُعا لکھ بھیجنا۔ بہ ہر حال میرا سلام نیاز عرض کیجیے اور اُن کے مزاج مُبارک کی خیر و عافیت لکھیے اور یہ لکھیے کہ اگر خدا نخواستہ وہ مجھ سے ناخوش ہیں تو ناخوشی کی وجہ کیا ہے؟ اپنے چچا صاحب کی خدمت میں سلام پہنچا دیجیے گا اور مولانا عطا کو سلام شوق کہیے گا۔

۱۸۵۹ء

(۱۰)

میرے مشفق کو میرا سلام پہنچے۔ دونوں مخمس بعد اصلاح پہنچتے ہیں، منشاء اصلاح سمجھ لیجیے۔ سیّد عالی نسب، سرورِ والا حسبی، یہ افتتاح کلام اور ابتدا خطاب کے درخور نہ تھا۔ مصرعۂ ثالث اس کی جگہ رکھ دیا گیا۔ دوسرے بند کی تخمیس دو طرح پہ ہے، دونوں بے عیب ہیں اور مزید لطف کسی میں نہیں۔ جن مصرعوں کو چاہو رہنے دو "گزشت از افلاک" و "آز افلاک گزشت" ایک فارسی رہا اور دوسرا ہندی، حضرت نے دونوں فارسی میں لکھے تھے۔ ندامت فعل پر مترتب ہوا کرتی ہے ترجمہ اس کا پشیمانی۔ حضرت یوسف کو ندامت کیوں ہو؟ مگر خجالت، اس کا ترجمہ ہے شرمندگی۔ آپ غور کیجیے کہ ندامت اور خجالت میں کتنا فرق ہے۔ جہاں آپ نے عرق ریزِ ندامت لکھا، وہ محل خجالت کا تھا، آپ نے ندامت کیوں لکھا؟ بہرحال وہ مصرع تو بدل گیا لیکن اطلاع ضرور تھی۔

"طرح" بفتح اول و سکون ثانی بمعنی فریب ہے اور تصویر کے خاکے کو بھی کہتے ہیں اور بمعنی آسایش دنیا بھی مجاز ہے۔ مرادف طرز و روش بھی طرح ہے، بفتحتین۔ اس کا تفرقہ منظور رہا کرے۔ نسیمؔ تخلص اچھا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ نسیم مؤنث ہے جواب اُس کا یہ ہے کہ جرأت اور وحشت اور ایسے بہت تخلص ہیں کہ وہ مؤنث ہیں، با ایں ہمہ اگر بدلا چاہیے تو اس کا ہم وزن سلام و سلیم اور خیال بھی ہے اس میں سے جو پسند آئے۔

آپ کے عمِ عالی مقدار اور آپ کے بزرگ آموزگار کو میرا سلام پہنچے۔

یہاں سے روئے سخن حضرت پیر و مرشد صاحب عالم کی طرف ہے۔ پیر و مرشد کی خدمت میں سلام اور مرشد زادوں کی جناب میں دعائے طولِ عمر و دوامِ دولت پہنچا کر یہ عرض کرتا ہوں کہ واقعی حضرت شاہ عالم کا عنایت نامہ آیا تھا اور میں اس

کا جواب بھیج چکا ہوں۔ عجیب ہے کہ حضرت کی تحریر میں جہاں اُن کے خط کا ذکر تھا، وہاں میرے خط کا مذکور نہ تھا اور ان سطور کی تحریر کے بعد اپنے خط کا پہنچنا گمان نہیں کر سکتا۔ میں اس ... یہاں کا حال لکھ چکا ہوں۔

"پنج آہنگ" آپ نے لی، دیوان فارسی آپ کے پاس ہے، مگر یوں سمجھیے کہ یہ دونوں ناتمام ہیں اور اب کہیں سے اُس کا اتمام ممکن نہیں۔ خیر جو کچھ ہے غنیمت ہے۔ "دستنبو" میں نے نذر کی ہے، "مہر نیم روز" معلوم نہیں آپ کے پاس ہے یا نہیں۔ خلاصہ یہ کہ شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔ اس فتنہ و فساد کے ... ایک قصیدہ جو دستنبو میں ہے اور ایک قصیدہ نواب لفٹننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی مدح میں اور دو بیت کا ایک قطعہ اور ایک رباعی۔ اس نظم کے سوا اگر کچھ لکھا ہو تو مجھ سے قسم لیجیے" قطعہ:

به آدم زن بشیطان طوقِ لعنت — سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم — گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

رباعی:

دنیا ہیچ است و شادی و غم ہیچ است — ہنگامۂ سور و بزمِ ماتم ہیچ است
رو دل بہ یکے دہ کہ دو عالم ہیچ است — ایں نیز فرو گذار کایں ہم ہیچ است

اس واماندگی کے دنوں میں چھاپے کی "برہان قاطع" میرے پاس تھی، اُس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط، ہزارہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پادر ہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور "قاطع برہان" اُس کا نام رکھا ہے۔ چھپوانے کا مقدور نہ تھا، مسودہ کاتب سے صاف کروا لیا ہے، اگر کہو تو بہ سبیل مستعار بھیج دوں۔ تم اور چودھری صاحب اور جو اور سخن شناس اور منصف ہوں وہ اس کو دیکھیں اور پھر مری کتاب میرے پاس پہنچ جائے۔

سنہ ۱۸۵۹ء

(۱۱)

جناب عالی "چھاچھا" ترجمۂ ہندی ہے، ایک بار "چھا" کفایت کرتا ہے۔ "انواع انواع" ہماری آپ کی بول چال میں ہے لیکن تحریر میں درست نہیں۔ "چمن پُر فضا" کو "چمن پُر فزا" زائے ہوز سے کیوں لکھا؟ خطاب واحد غائب نقطہ "شین" ہے نہ "اش" ہاں اگر آخر لفظ مبنی ہائے انتہائی حرکت پر ہو، مثل غمزہ وچشمہ وخانہ ودانہ تو اس کو یوں لکھتے ہیں۔ "چشمہ اش" "غمزہ اش" "خانہ اش" "دانہ اش" اور باقی اور سب الفاظ کا حرف۔ آخر شین سے مل جاتا ہے۔ خطاب واحد حاضر، خطاب واحد غائب، خطاب متکلم 'ت' 'ش' 'م' ہے۔ الف کو یہاں کیا دخل؟ اور اور وہ جو دکھنی بوہرہ یعنی جامع "برہان قاطع" 'ات' 'اش' 'ام' لکھتا ہے، غلط کرتا ہے۔ جہاں تم نے بعد اپنے نام کے یہ اشعار لکھے ہیں:

پریشاں تر ز خویشم داستانے است

وہاں ربط کلام جاتا رہا تھا۔ ایک جملہ فاصل کر دیا ہے۔ یعنی بدیں اشعار زمزمہ سراست یہ خبر اُس کاف توصیفی کی ہے اور آگے جو نثر ہے اُس کا فاعل وہی مصنف ہے۔ پیرو مرشد صاحب عالم صاحب کی خدمت عالی میں میرا اسلام مسنون عرض کیجیے گا اور یہ عرض کیجیے گا کہ آپ کے منشور عطوفت کا جواب بانفراد آپ کی خدمت میں پہنچے گا۔

(۱۲)

میرے شفیق دلی کو میرا اسلام پہنچے۔ کل انشاء کا پارسل پہنچا اور آج خط۔ انشاء کا نام بہارستان اور آپ کا تخلص سرور اچھا نام ہے۔ قطعہ کا وعدہ نہیں کرتا کس واسطے کہ اگر بے وعدہ پہنچ جائے گا تو لطف زیادہ دے گا اور نہ پہنچے گا تو محل شکایت نہ ہو گا۔

رفع فتنہ و فساد اور بلاد میں مسلم، یہاں کوئی طرح آسایش کی نہیں ہے۔ اہلِ دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے۔ یہ داغ ان کی جبینِ حال سے مٹ نہیں سکتا۔ ہیں اموات میں ہوں، زندہ شعر کیا کہے گا؟ غزل کا ڈھنگ بھُول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟ ہائے انوری گویا میری زبان سے کہتا ہے:

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح — اے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

گورنمنٹ کے دربار میں ہمیشہ سے میری طرف سے قصیدہ نذر گزرتا ہے، اشرفیاں نہیں اور خلعت ریاست دو دمانی کا سات پارچہ اور تین رقم جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید، مجھ کو ملا کرتا ہے۔ اب نواب گورنر جنرل بہادر یہاں آتے ہیں۔ دربار میں بلائے جانے کی توقع نہیں، پھر کس دل سے قصیدہ لکھوں؟ صناعت شعر اعضا و جوارح کا کام نہیں، دل چاہیے، دماغ چاہیے، ذوق چاہیے، امنگ چاہیے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں؟ چونسٹھ برس کی عمر، ولولۂ شباب کہاں؟ رعایتِ فن، اس کے اسباب کہاں؟ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۱۳)

میرے شفیق دلی چودھری عبدالغفور صاحب کو خدا سلامت رکھے۔ دیکھو میرے حواس کا اب یہ عالم ہے کہ تمھارے نام کی جگہ تمھارے چچا صاحب کا نام لکھا تھا۔ اسی طرح سابق کے خط میں سرنامے پر یہ لکھا ہوگا:

بہار پیشہ جوانے کہ غالبش نامند — کنوں بہ بیں کہ چہ خوں مے چکد ز نفسش

جو خط کہ آپ کے خطوط کے جواب میں آئے، ان کے بھیجنے کی کیا حاجت تھی[1]؟ آپ

---

[1] اس سے واضح ہے کہ غالب کی فرمایش کے مطابق سرور نے "اردو اخبار" دہلی کے اس نمبر کے لیے جگہ جگہ سعی کی تھی، پر وہ اخبار نہ مل سکا اور غالب کو اپنی سعی کا پورا یقین دلانے کے لیے اس نے وہ تمام خطوط بھیج دیے تھے جو طلب اخبار کے سلسلے میں اسے موصول ہوئے تھے۔

کی سعی اور اپنی ناکامی پہلے سے میرے دلنشین اور خاطر نشان ہے، جیسا کہ کوئی اُستاد کہتا ہے:

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل   کہ خضر از آب حیواں تشنہ مے آرد سکندر را

وہ اخبار نہ کہیں سے ہاتھ آیا اور نہ آئے گا۔ مَیں اپنے خدا سے امیدوار ہوں کہ میرا کام بغیر اس کے نکل جائے گا۔

بندہ پرور، میرا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کیا اُردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہُوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے سو اُن کے لاکھوں روپے کے گھر لُٹ گئے۔ جس میں ہزاروں روپے کے کتاب خانے بھی گئے۔ اس میں وہ مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہُوئے۔ میں خود اس مثنوی کے واسطے خون در جگر ہوں۔ ہائے کیا چیز تھی، پارسل میں خطوط بھیجنے محل اندیشہ ہے، خدا نے بچایا۔ چونکہ اب وہ خط آپ کے کچھ کام کے نہ سمجھا، از راہ احتیاط پارسل میں سے نکال لیے۔

(۱۴)

جناب چودھری صاحب کی یاد آوری اور مہر گستری کا شکر بجا لاتا ہوں۔ آپ کا خط مع قصیدہ و مثنوی پہنچا۔ مثنوی کو جداگانہ بطریق پمفلٹ پاکٹ بھیجتا ہوں اور یہ خط جداگانہ ارسال کرتا ہوں۔ لفافہ اس کا بھی آپ کے نام کا ہے۔ آپ کے جواب کا ماجرا اور صبح کو ادھر کا قصد اور پھر اپنے چچا صاحب کے کہنے سے نظر تا بستان پر اس عزم کا ملتوی رکھنا معلوم ہُوا۔ آپ کے چچا صاحب نے کرامت کی کہ جو آپ کو منع کیا۔ ڈاک کی سواری پر اگر آپ اس شہر میں میرے مکان پر آپ آجاتے تو ممکن تھا مگر رہنا شہر میں بے حصول اجازت حاکم احتمال ضرر رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو،

اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے۔ زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجیے گا کہ دلّی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلادِ شرقیہ کی مثل ہے یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے۔ نہ قانون، نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں آوے، وہ ویسا ہی کرے۔ بہ ہر حال:

اے وائے زمحرومی دیدار دگر، ہیچ

انشا اللہ العظیم دو تین مہینے میں یہاں بھی صورت امن و امان کی ہو جائے گی، مگر میری آرزو بانسیفا اس صورت میں بھی بر نہ آئے گی۔ میں یہ تاکے ہوئے ہوں کہ میری اور تمھاری ملاقات اس طرح سے ہو کہ ہم تم ہوں، اور حضرت صاحب عالم صاحب ہوں، اور باہم حرف و حکایت کریں۔ اگر زمانہ میری خواہش کے موافق نقش قبول کرتا ہے تو میں مارہرہ کو آتا ہوں۔ حضرت پیر و مرشد کا اشتیاق اور اسی جلسہ میں تمھارے دیدار کا شوق ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو آرام سے بیٹھا رہنے دے گا۔

صاحب یہ مثنوی تو میرے واسطے ایک مرتبہ ہو گئی ہے۔ اس بزرگوار کے جگر میں کیا کیا گھاؤ پڑے ہوں گے تب یہ تراوش خونابہ ظہور میں آئی ہوگی۔ مزا یہ ہے کہ عنوان بیان سے حق بجانب انھیں کے معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اصل کاغذ میری نظر میں نہیں اور حقیقت حال مجھ پر مجہول ہے۔ اس واسطے انجام و آغاز، اندازہ و انداز کچھ نہیں سمجھا۔ حک و اصلاح کو آپ بہ نظر امعان ملاحظہ فرمائیں۔ میں نے بحسب دستور ہر جگہ منشاء اصلاح لکھ دیا ہے۔ شیخ صاحب سے میرا سلام کہیے گا اور کہیے گا کہ کیا کروں، دُور ہوں، معذور ہوں۔ مدد نہیں کر سکتا۔ اعانت کے مراسم تقدیم کو نہیں پہنچا سکتا۔ خدا تمھارا نگہبان رہے۔ والسلام

(۱۵)

جناب عالی،

آپ کا تفقدنامہ مرقومہ یازدہم شعبان ۱۲۷۷ھ مطابق پنجم مارچ ۱۸۶۱ء،

بقید روز دوشنبہ پہنچا۔ پہلے تو ان تاریخوں کے حساب سے تطابق میں میں الجھا، پھر خط کے پہنچنے سے بہت خوش ہوا۔ ڈاک کیا ہے۔ خاک ہے۔ خیر ادھر پڑھا ادھر جواب لکھا۔ خدا کرے یہ میرا خط جلد پہنچے، ورنہ یہ آپ کو خیال ہو گا کہ غالب نے ہمارے خط کا جواب نہ لکھا۔

حقیقت میری مجملاً یہ ہے کہ راہ و رسم مراسلت حکام عالی مقام سے بدستور جاری ہو گئی ہے۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کو نسخہ "دستنبو" بسبیل ڈاک بھیجا تھا، ان کا خط فارسی مشعر تحسین عبارت و قبول صدق ارادت و مودت بسبیل ڈاک آ گیا۔ پھر قصیدہ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا، اس کی رسید آ گئی۔ وہی "خان صاحب بسیار مہربان دوستان" القاب اور کاغذ افشانی انداز بعد ایک قصیدہ جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی مدح میں بہ توسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا، اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بہ توسط کمشنر بہادر مجھ کو آ گیا۔ پنسن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔ جب ملے گی حضرت کو اطلاع دی جائے گی۔

پیر و مرشد عالم ہیں اور میں جاہل ہوں۔ ان کے تسلیم نہ کرنے کو میں نے تسلیم کیا اور پھر تسلیم بجا لایا۔ اے حضرت جناب مخدوم مکرم چودھری غلام رسول صاحب کی خدمت میں انھیں الفاظ میں رسم مبارکباد ادا کی گئی تھی۔ نہ عبارت آرائی، نہ طبع آزمائی۔ کچھ عجب نہیں کہ وہ خط بھی مئی اور جون میں آپ کو پہنچ جائے۔ آپ کا بھی تو مارچ کا خط مجھ کو اب آخر اپریل میں پہنچا ہے۔

جناب شیخ صاحب کیوں مجھ کو محجوب کرتے ہیں؟ اس باب میں اس سے زیادہ عرض نہیں کر سکتا کہ افادہ مشترک ہے۔ قصیدہ و مثنوی بھیج دیجیے، لطف اٹھاؤں گا اور جو کچھ میرے خیال میں آئے گا بے تکلف عرض کروں گا۔ میرا اسلام کہیے اور مثنوی

اور قصیدہ ان سے لے کر جلد بھیج دیجیے۔ اپنے عم عالی مقدار کی خدمت میں میرا سلام پہنچایئے اور کہیے کہ حضرت خلاصہ مکتوب سابق یہی الفاظ ہندی سے تھے۔ شاید یہ تعبیر بالمرادف ہو، تو ہو۔ یہ شادی بصد ہزار مسرت آپ کو مبارک ہو اور ان کی اولاد یعنی اور اسی طرح ان کی شادی کرنی نصیب ہو۔ فیض علی خاں صاحب کو میرا سلام پہنچے۔ میں بھی آپ کی ملاقات کا مشتاق اور آپ کا مداح رہوں گا۔ خط کا لفافہ اس خط میں ملفوف کر کے بھیجتا ہوں۔ یہ آج پہنچا اور آج ہی میں نے اس کا جواب لکھا۔ کاتب وہی ہے جو لفافہ ملفوفہ کا مکتوب الیہ ہے۔

(اپریل ۱۸۶۰ء)

(۱۶)

میرے مشفق چودھری عبدالغفور صاحب اپنے خط اور قصیدہ بھیجنے کا مجھ کو شکرگزار اور قصیدۂ سابق کی اب تک اصلاح نہ پانے سے شرمسار تصور فرمائیں اور ان دونوں قصیدوں کے باہم پہنچنے کا انتظار کریں۔

نوید وصل دیم مے دہد ستارہ شناس　　نکردہ ژرف نگاہے مگر در اختر من

تحقیق کہ اب روئے سخن جناب فیض نصاب جامع مدارج جمع الجمع، بزم وحدت کے فروزندہ شمع مستغرق مشاہدہ شاہد ذات، حضرت صاحب عالم صاحب قدسی صفات کی طرف ہے اور یہ شعر افتتاح کلام ہے[۱]۔

پہلے کچھ باتیں کہ بادی النظر میں خارج از بحث معلوم ہوں گی لکھی جاتی ہیں۔ میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض

---

[۱] وہ شعر جو اوپر نقل ہوا ہے یعنی:

نوید وصل دیم مے دہد ستارہ شناس　　نکردہ ژرف نگاہے مگر در اختر من

میری اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خان، دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصّہ ساڑھے سات سو روپے سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ[1] صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریزیڈنٹ معزول ہوگئے سکرتر گورنمنٹ مرگ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا۔ ان کے ولیعہد[2] نے چار سو روپے سال۔ ولیعہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی، سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اب میں جو والی دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والیِ شہر مجھ کو کچھ نہ دیگا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوند بندہ پرور

۱؎ اسٹرلنگ ۱۸۱۲ء میں ہندوستان آئے۔ فارسی کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے حکومتِ ہند میں معزز عہدوں پر ممتاز رہے ۱۸۳۰ء میں ۳۵، ۳۶ برس کی عمر میں وفات پائی۔ کلیاتِ غالب (فارسی) میں ان کی مدح میں ایک قصیدہ اور وفات پر ایک قطعہ موجود ہے۔

۲؎ شہزادہ فتح الملک بہادر عرف میرزا فخرو بہادر شاہ کے ولی عہد۔ ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو وفات پائی۔ بیماری کی صورت ایسی تھی کہ بعض حلقوں میں شبہ پیدا ہوا کہ انھیں زہر دیا گیا ہے۔

یہ سب باتیں دقوعی اور واقعی ہیں اگر ان سے قطع نظر کرکے قصیدے کا قصد کروں، قصد تو کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا؟ سوائے ایک ملکہ کے کہ وہ پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے، کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر مَیں نے کیوں کر لکھی تھی اور یہ شعر کیوں کر کہے تھے۔ عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے:

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

پایانِ عمر ہے دل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔ سو روپے رام پور کے، ساٹھ روپے پنشن کے روٹی کھانے کو بہت ہیں۔ گرانی اور ارزانی امورِ عامہ میں سے ہے۔ دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلے کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں۔ دیکھو منشی نبی بخش مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے، ماہ گزشتہ میں گزر گئے۔[۱] مجھ میں قصیدے کے لکھنے کی قوت کہاں؟ اگر ارادہ کروں تو فرصت کہاں؟ قصیدہ لکھوں، آپ کے پاس بھیجوں، آپ دکن کو بھیجیں، متوسط کب پیش کرنے کا موقع پائے؟ پیش کیے پر کیا پیش آئے؟ ان مراحل کے طے ہونے تک مَیں کیوں کر جیوں گا؟ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ لا الٰہ الا اللہ و لا معبود الا اللہ و لا موجود الا اللہ، کان اللہ و لم یکن شیئ و اللہ الآن کما کان۔

سنہ ۱۸۶۰ء

۱۔ منشی نبی بخش حقیر کے انتقال کا سال معلوم ہے یعنی ۱۲۷۷ھ غالب نے ان کی تاریخ کہی تھی:

گفت مہ طول دبگو "دستگیر"

اس سے ظاہر ہے کہ یہ خط ۱۸۶۰ء کا ہے۔

(۱۷)

جناب چودھری صاحب کو سلام پہنچے۔ آپ نے اپنے مزاج کی ناسازی کا حال کچھ نہ لکھا۔ اگر پیر و مرشد بھی نہ لکھتے تو مَیں کیوں کر اطلاع پاتا اور اگر اطلاع نہ پاتا تو حصولِ صحت کی دعا کیوں کر مانگتا؟ کل سے وقت خاص میں دعا مانگ رہا ہوں یقین ہے کہ پہلے تم تندرست ہو جاؤ گے ازاں بعد یہ خط پاؤ گے۔ اکثر صاحب اطراف و جوانب سے "ماہ نیم ماہ" بھیجنے کا حکم بھیجتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب "مہر نیمروز" کی عبارت کو نہیں سمجھے تو "ماہ نیم ماہ" کو لے کر کیا کریں گے۔ صاحب! "مہر نیمروز" کے دیباچے میں مَیں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام "پرتوستان" ہے اور اس کے دو مجلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدائے خلقت عالم سے ہمایوں کی سلطنت تک کا ذکر، دوسرے حصے میں اکبر سے بہادر شاہ تک کی سلطنت کا بیان۔ پہلے حصے کا نام "مہر نیمروز" دوسرے حصہ کا اسم "ماہ نیم ماہ"۔ بارے پہلا حصہ تمام ہُوا، چھاپا گیا، قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات کے لکھنے کا کہ امیر تمر تک کا نام و نشان مٹ گیا۔ "آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد۔" جو کتاب میں نے لکھی ہی نہ ہو وہ بھیجوں کہاں سے؟

پیر و مرشد کو میری بندگی اور صاحبزادوں کو دُعا۔ خداوند مجھے مارہرہ بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں۔ ان دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی۔ شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں؟ طاقت کہاں سے پاؤں؟ نہ آموں کی طرف وہ رغبت، نہ معدے میں اتنی آموں کی گنجائش۔ نہار مُنہ مَیں آم نہ کھاتا تھا کھانے کے بعد

ہیں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں، جو کہوں بین الطعامین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا، بے تکلف عرض کرتا ہوں، اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ، اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات:

دریغا کہ عہد جوانی گزشت　　جوانی مگو زندگانی گزشت

اب اس کے واسطے کیا سفر کروں؟ مگر حضرت کا دیکھنا اس کے واسطے تحمل رنج سفر ہوں تو جاڑے میں، نہ برسات میں:

اے وائے زمحرومی دیدار و دگر ہیچ

(۱۸)

میرے مشفق

آپ کا خط آیا اور اس کے آنے نے تمھاری رنجش کا وسوسہ میرے دل سے مٹایا۔ ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں اگر اس کو منظور کیجیے تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اُٹھ جائے گا۔ اور رجسٹری کا درد سر جاتا رہے گا۔ آدھ آنہ نہ سہی ایک آنہ سہی، آپ بھی خط بیرنگ بھیجا کیجیے اور مَیں بھی بیرنگ بھیجا کروں۔ پیڈ خطوط تلف بھی ہوتے ہیں۔ اس قاعدے کا جیسا کہ میں واضع ہوا ہوں، بادی بھی ہُوا اور یہ خط بیرنگ بھیجا[۱]۔

پنشن جاری ہوگیا۔ تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا۔ بعد ادائے قرض ستاسی روپے گیارہ آنے بچے۔ اب ماہ بماہ روپیہ ملتا ہے مگر یہی تین مہینے ستمبر، اکتوبر، نومبر میں گے۔ دسمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ شش ماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپے سینکڑا سالانہ عموماً وضع ہوا کرے گا، اس حساب سے میرے حصہ میں ڈھائی روپیہ مہینہ آیا۔ باسٹھ آٹھ آنے کے ساٹھ

۱۔ لیکن اس سے پہلے خود سرور کے کہنے پر ایک خط بیرنگ بھیجا تھا۔

رہیں گے۔ کچھ رام پور سے ماہ بماہ آتا ہے یہ دونوں آمدنیں مل کر خوش وناخوش گزارا ہو جاتا ہے۔

یہاں شہر ڈھے رہا ہے بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار اور اُردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبانِ امکنہ و دکانیں نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ اب تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے۔ غلّہ گراں ہے، موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال ۸ سیر، باجرہ ۱۶ سیر، گیہوں ۱۲ سیر، چنے ۱۶ سیر، گھی ۱۰ سیر، ترکاری مہنگی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ کنوار کا مہینہ جسے جاڑے کا دوار کہتے ہیں۔ پانی گرم، دھوپ تیز، لو چلتی ہے، جیٹھ اساڑھ کی سی گرمی پڑتی ہے۔

حضرت رفعت درجت جناب صاحب عالم کی خدمت میں دوستانہ سلام اور مریدانہ بندگی بہ انکسار تمام عرض کرتا ہوں۔ حضرت کو کس راہ سے میرے آنے کا انتظار ہے؟ میں نے مرشدزادے کے خط میں کب اپنا عزم لکھا؟ کس نے آپ سے میری زبانی کہا کہ آپ روز روانگی کے تقرر سے اطلاع چاہتے ہیں؟ ہاں آپ کی قدمبوسی کی تمنّا اور انورالدولہ کے دیدار کی آرزو حد سے زیادہ ہے اور ایسا جانتا ہوں کہ یہ آرزو گور میں لے جاؤں گا۔ تنخواہ کے اجرا کا حال اور مستقبل میں اس کے وصول کی صورت ان سطروں سے جو آغاز مکتوب میں چودھری عبدالغفور صاحب کی خدمت میں لکھی گئی ہیں، مع روداد شہر معلوم کر لیجیے گا۔

لالہ گوبند پرشاد صاحب ہنوز میرے پاس نہیں آئے ہیں۔ دنیادار نہیں؛

فقیر خاکسار ہوں۔ تواضع میری خو ہے۔ انجاح مقاصد خلق میں حتی الوسع کمی کروں تو ایمان نصیب نہ ہو۔ انشا اللہ العزیز وہ فقیر سے راضی اور خوشنود رہیں گے۔

جناب مستطاب حضرت محمد امیر صاحب کی خدمت میں بعد سلام نیاز یہ گزارش ہے کہ میرے پاس حضرت کا سلام و پیام اب کی بار بھی نہیں پہنچا۔ اب ان سطور کو اپنا ذریعہ افتخار سمجھا اور نوید مقدم مبارک سے بہت خوش ہوا۔ یہ خانہ کوچی اور گریز پائی اور بے اطمینانی کا آپ کو مجھ پر گمان ہے اور اس کا رنج ہے، یہ خلاف واقع کس نے آپ سے کہا ہے؛ میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا نہ نکالا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور کیا نفس مطمئنہ بخشا۔ جان و مال و آبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔ تنخواہ جس کو حضرت نے یومیہ لقب دیا ہے، اس کا حال اُوپر کی تحریر سے دریافت ہو گا۔ فقیر کو اپنا دوست اور معتقد اور مشتاق تصوّر فرماتے رہیے گا۔ مرشد زادہ مرتضوی دودمان سید شاہ عالم کو سلام و دعا۔ ڈپٹی صاحب سے مجھ سے ملاقات کثرت سے نہیں ہے، ان کو کثرت اشغال سے فرصت نہیں، مجھ کو افراط ضعف سے طاقت نہیں۔ اگر بحسبِ اتفاق کہیں ملاقات ہو گئی تو آپ کا سلام کہہ دوں گا۔ آپ اپنے اخوان عالی شان کو میرا سلام پہنچا دیجیے گا:

بندۂ شاہِ شمائیم و ثنا خوانِ شما

(ستمبر ۱۸۶۰ء)

(۱۹)

حضرت چودھری صاحب عنایت نامۂ سابق:

تھا تو خط، پر نہ تھا جواب طلب　کوئی اس کا جواب کیا لکھتا

آج دوپہر کو یہ خط پہنچا، آج ہی آخر روز جواب لکھ کر رکھ چھوڑتا ہوں، کل صبح کو بشرط حیات ڈاک میں بھجوا دوں گا۔ "قاطع برہان" کے مجلدات جو بموجب توقیع خریدار میری ملک ہیں، وہ اوّل جولائی میں میرے پاس اور اُن میں سے دو مجلد آخر جولائی میں آپ کے پاس پہنچیں گے۔ ایک آپ رہنے دیں گے اور ایک پیر و مرشد کی نذر کریں گے۔ انشاء اللہ العلی العظیم

حبذا فیض تعلق معجزِ کلکش نگر　گر رود صد سالہ رہ پیش نظر باشد ہماں

یہ شعر مولانا نورالدین ظہوری رحمۃ اللہ علیہ کا ممدوح کی خوشنویسی کی تعریف میں ہے۔ مبالغہ سرحد تبلیغ و غلو کو پہنچ گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اُس کا لکھا ہُوا قطعہ یا کوئی عبارت سو برس کی راہ پر سے آدمی کو نظر آتی ہے۔ وجہ اس کی یہ کہ حرف بہت روشن، صاف اور جلی ہیں اور چونکہ یہ امر بحسب عادت و عقل ممتنع ہے اس رو سے اس کو معجزۂ قلم کہا اور چونکہ معجزہ خرق عادت ہے اور خرقِ عادت ایک امر ہے مسلمات جمہور میں سے، پس منکر کو گنجایش انکار نہ رہی۔ یہاں یہ خیال آئے گا کہ "فیض تعلق" بے کار رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ حسن الہام نہ ہے، یعنی نگاہ کو ازانجا کہ باصرہ مشتاق حسن ہے، اُس خط سے وہ تعلق بہم پہنچا ہے کہ اگر وہ خط سو برس کی راہ پہ ہو، تو بھی نگاہ اُس سے متعلق رہتی ہے، جیسے طائر کو اپنا آشیانہ اور مسافر کو اپنا وطن اور عاشق کو معشوق کا خد و خال مسافت بعیدہ سے پیش نظر رہتا ہے۔ چاہو ایک معلول کی دو علت سمجھو: فیض تعلق مذکور اور حسنِ خط مقدر، چاہو

فیض تعلق کو ادعا کہو اور حسن خط جو تقدیر میں ہے اُس کو سبب سمجھو تعلق کا اور موکد جانو ادعا کا۔ سنو وعدے کے واسطے دلیل موضوع ہے۔ ادعا کو دلیل ضرور نہیں ہے۔ ہاں ادعا پر تاکید طریقۂ بلاغت ہے۔ یہ لطافت معنوی خاص اس بزرگ کے حصے میں آئی ہے۔ مَیں جانتا ہوں مشتری اور عطارد نے مل کر ایک صورت پکڑی تھی۔ اس کا اسم نورالدین اور تخلص ظہوری تھا۔

اللہ اللہ فرماتا ہے:

مروت کردشبہا بر تو سیر بام و در لازم　　نے باشد چراغے خانہ ہائے بے نوایاں را

ظہوری کا ممدوح اور معشوق ایک ہے یعنی سلطان جلیل القدر ابراہیم عادل شاہ۔ پادشاہوں کے منظر بلند ہوتے ہیں اور کیا بعید ہے کہ رعایا و ملازمین میں سے کچھ لوگ زیر قصر رہتے ہوں، اس واسطے بادشاہ دن کو اُس منظر بلند پر نہیں چڑھتا کہ مبادا رعیت یا ملازموں کی جورو بیٹیاں نظر آئیں۔ رات کو اُن کے گھر تاریک ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بلند مکان پر چڑھا تو کچھ نظر نہ آئے گا۔ یہ مدح ہوئی عفت کی، و عفت ایک فضیلت ہے فضائل اربعہ میں سے۔ اب ابراہیم کی مدح سنیے۔ ممدوح نے راتوں کو کوٹھے پر چڑھنا اپنے اوپر لازم کیا ہے، اس واسطے کہ رعایا کے گھروں میں چراغ نہیں۔ اگر کسی کو کسی کپڑے میں پیوند لگانا یا کوئی چمڑے کی چیز گانٹھنی یا کسی مریض کا تفحص حال منظور ہو تو وہ گھر اس ممدوح کے پرتو جمال سے روشن ہو جائے، چراغ کی حاجت باقی نہ رہے۔ جو کام جو شخص چاہے وہ کرے۔ مروّت کے لفظ کا مزہ وجدانی ہے۔ سوائے اس لفظ کے کوئی لفظ یہاں کام نہیں آتا۔ اگر حفظ ناموس رعایا ہے تو مروّت ہے اور اگر مفلسوں کی کار برآری ہے تو مروّت ہے۔ قالب معنی کی جان ہے ظہوری، ناطقہ کی سرافرازی کا نشان ہے ظہوری۔ زیادہ

کیا لکھوں؟
(جون سنہ ۱۸۶۲ء)

(۲۰)

جناب چودھری صاحب،

آپ کے تلطف نامہ کے ورود کی مسرت اور پارسل کے نہ پہنچنے کی حیرت، باعث اس کی ہوئی کہ آپ کو پھر تکلیف دوں اور باآنکہ خط جواب طلب نہ تھا، جواب لکھوں۔ بندہ پرور میں نے پارسل کی رسید لے لی تھی۔ اب آپ کے خط کو پڑھ کر کارپردازان ڈاک کے پاس وہ رسید بھجوائی، انھوں نے کتاب دیکھ کر میرے آدمی سے کہہ دیا کہ سکندرہ راؤ کی رسید یہ موجود ہے۔ اب پارسل کی جواب دہی وہاں والوں کے ذمہ ہے۔ یہ سُن کر میں نے یہ مناسب جانا کہ وہ رسید آپ کے پاس بھیج دوں۔ آپ سکندرہ راؤ کے ڈاکخانہ میں بھجوا کر اُن سے پارسل منگوا لیں اور اب اس رسید کا میری طرف راجع ہونا کسی صورت میں ضرور نہیں۔ والسلام۔

سنہ ۱۸۶۲ء

(۲۱)

جناب چودھری صاحب،

سیاہی پھیکی، کاغذ پتلا۔ پیرومرشد کی عبارت ایک طرف آپ کی تحریر بھی مغشوش ہو گئی۔ بہرا ہو گیا ہوں مگر حدت بصر ہنوز باقی ہے۔ تمھاری عبارت کا جو لفظ پڑھ لیا، قرینے سے اس کا محاورہ بھی معلوم ہو گیا۔ حضرت کی تحریر کا ایک لفظ سوائے سعادت توام شاہ عالم کے اگر پڑھا گیا ہو تو دیدے پھوٹیں، ایمان نصیب نہ ہو۔ وہ خط بدستور آپ کے پاس واپس بھیجتا ارد لی سفید کاغذ[1] پر

---

[1] ایک قسم کا سفید کاغذ جو ذرا دبیز ہوتا ہے۔

حرف بحرف اس کی نقل کر کے پھر مجھے بھیج دیجیے تاکہ اس کے جواب لکھنے میں سعادت حاصل کروں۔ لیکن بہت جلد، بہت جلد۔ آپ کی نگارش سے اتنا اندیشہ ہوگیا۔ اب آپ اچھے ہیں۔ الحمد للہ۔ جناب ممتاز علی خاں صاحب کہاں اور مارہرہ کہاں۔ بہ ہر حال میرا سلام۔

(۲۲)

بندہ پرور،

بہت دن کے بعد پرسوں آپ کا خط آیا۔ سرنامہ پر دستخط اور کے اور نام آپ کا پایا۔ دستخط دیکھ کر مفہوم ہُوا، خط کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ تمھارے دشمن بعارضہ تپ و لرزہ رنجور ہیں۔ اللہ اللہ ضعف کی یہ شدّت کہ خط کے لکھنے سے معذور ہیں! خدا وہ دن دکھائے کہ تمھارا خط تمھارا دستخطی آئے۔ سرنامہ دیکھ کر دل کو فرحت ہو، خط پڑھ کر دونی مسرت ہو۔ جب تک ایسا خط نہ آئے گا، دل سودا زدہ آرام نہ پائے گا۔ قاصد ڈاک کی راہ دیکھتا رہوں گا جناب ایزدی میں سرگرم دعا رہوں گا۔ آپ کے عم عالی مقدار اور بزرگ آموزگار کو میرا سلام مع صنوف اشتیاق و الوف احترام۔

جناب چودھری صاحب، آؤ ہم تم حضرت عالم کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں ان کے کف پائے مبارک سے ملیں۔ میں سلام عرض کروں گا، تم معرف ہونا کہ غالب یہی ہے، اہل دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے۔ میں نے عزم قدم بوسی کیا، پیر و مرشد نے مجھے گلے لگایا، فرماتے ہیں کہ "غالب تو اچھا ہے؟" عرض کرتا ہوں کہ "الحمد للہ، حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے؟" ارشاد ہُوا کہ "مولوی سیّد برکات حسن تیری بہت تعریف کرتے سنے ہیں" "جناب یہ ان کی خوبیاں ہیں میں ایسا نہیں ہوں جیسا وہ کہتے ہیں۔

کاش وہ میری رنجوری کا حال کہتے۔ ضعف قویٰ و اضمحلال کہتے تاکہ میں ان کے کلام کی تصدیق کرتا۔ ان کی غمخواری اور دردمند نوازی کا دم بھرتا:

در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن   اینکہ من نمی میرم ہم زناتوانیہاست

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا۔ "بوستان خیال" کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اٹھاؤں؟ حضرت سچ تو یوں ہے کہ غمہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے، سانس نہیں لے سکتا، اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی، پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچا ہوں: ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یوں ہی رویا کروں گا، دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دلنشین ہے، نتیجہ اس کا تسکین ہے۔ ہیہات:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید   ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

اے حضرت شاہ عالم صاحب میرا سلام لیجیے۔ کاغذ باقی نہیں رہا اپنے سب بھائیوں کو مع میر وزیر علی صاحب میرا سلام کہہ دیجیے گا۔

سنہ ۱۸۶۰ء

(۲۲۳)

چودھری صاحب مشفق مکرم کو میرا سلام،

آپ کا خط کہ سوائے چند سطر کے جو تم نے لکھی تھیں، سراسر حضرت صاحب کا دستخطی تھا، پہنچا۔ سبحان اللہ حضرت کو کس قدر محبت ہے تمہارے ساتھ۔ تمہاری ناسازی مزاج کا کیسا ملال اور تمہارے نہ دیکھنے کا کیسا رنج ہے؟ سچ یوں ہے کہ تم خوبانِ روزگار میں سے ہو۔ توقیع قبول اہل نظر کا حاصل ہونا

آسان نہیں ہے۔ سلامت رہو خوش رہو مختصر:

کارت بجہاں جملہ چناں باد کہ خواہی

اب روے سخن حضرت صاحب کی طرف ہے۔ خدمت خدامِ مخدوم خادم نواز میں بعد تسلیم معروض ہے، تفقد نامۂ نامی میں صورت عزّ و شرف نظر آئی، اللہ اللہ! تم نے میری نظر میں میری آبرو بڑھائی۔ حضرت کی قدردانی کی کیا بات ہے۔ آپ کا التفات موجب مباہات ہے۔ یہ بات بطریق طے لسان زبان پر آئی ہے ورنہ قدردانی کیسی، یہ قدر افزائی ہے۔ نظیری علیہ الرحمۃ کا شعر ایک کاغذ پر لکھ کر میرے گلے میں ڈال دیجیے اور زمرۂ شعرا میں سے مجھ کو نکال دیجیے۔ شعر یہ ہے:

جوہرِ بینشِ من در تہِ زنگار بماند آنکہ آئینہ من ساخت نہ پرداخت دریغ

دعوے اور چیز ہے اور کمال اور ہے۔ علم عربی اور شے ہے اور فارسی کی حقیقت حال اور ہے۔ جلالاے طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ نے سیدائے ہندی کو ایک رقعہ لکھا۔ عبارت اس وقت یاد نہیں آتی مگر یہ مضمون اس کا کہ ایک دن مولانا عرفی علیہ الرحمۃ اور ابو الفضل میں مباحثہ ہوا۔ شیخ نے عرفی سے کہا کہ "ہم نے تحقیق کو بسر حد افراط پہنچا دیا اور فارسی میں خوب کمال پیدا کیا" عرفی نے کہا کہ "اس کو کیا کرو گے کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، گھر کے بڈھوں سے اور بڈھیوں سے جو بات سُنی، فارسی میں سنی۔" شیخ گفت ما فارسی از انوری و خاقانی فرا گرفتہ ایم، و شما از پیر زناں آموختہ اید" عرفی فرمود "انوری و خاقانی نیز از پیر زناں آموختہ باشند"۔ ختم

غالب کہتا ہے کہ ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ کے سوا کوئی اُستاد مسلم الثبوت نہیں ہُوا۔ خسرو کیخسرو قلمرو سخن طرازی ہے یا ہم چشم

نظامی گنجوی وہم طرح سعدی شیرازی ہے۔ خیر فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے، کلام اُس کا پسندیدۂ جمہور ہے۔ دیکھو عبدالقادر بدایونی کیا لکھتا ہے۔ رہے[1] . . . (؟) آرزو فقیر اور شیدا اور بہار وغیرہم انھیں میں آ گئے، ناصر علی اور بیدل اور غنیمت اُن کی فارسی کیا؟ ہر ایک کا کلام بنظر انصاف دیکھیے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟

منت اور مکین اور واقف اور قتیل یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔ ان حضرات میں عالم علوم عربیہ کے شخص ہیں، خیر ہوں، فاضل کہلائیں، کلام میں اُن کے مزا کہاں؟ ایرانیوں کی سی ادا کہاں؟ فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے، اس میں پیروی قیاس ایک بلائے عام ہے۔ وارستۂ سیالکوٹی نے خانِ آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔ باایں ہمہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، مُنہ کی کھاتا ہے۔ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائع لفظی میں دستگاہ اچھی تھی۔ اس شیوہ و روش کو خوب برتتے گئے، فارسی وہ کیا جانیں؟ قاضی محمد صادق اختر عالم ہوں گے شاعری سے ان کو کیا علاقہ؟ ایک بات حضرت کو اور معلوم رہے کہ ہندی فارسی والوں نے کمال کو وہم میں منحصر رکھا ہے۔

کالپی کے نواب زادوں میں سے ایک صاحب قتیل کے شاگرد تھے۔ میں نے ایک رقعہ قتیل کا اُن کے نام دیکھا ہے کہ قتیل اُن کو لکھتا ہے کہ جامہ گزاشتن بمعنے مردن مسلّم۔ لیکن بہت احتیاط کیا کرو موقع دیکھ لیا کرو جب لکھا کرو۔ میں کہتا ہوں کہ احتیاط کیا اور موقع کیا؟ "فلاں مُرد" "بہماں جامہ گزاشت" پھر وہ کہتا ہے کہ "کدہ" کے ساتھ سوائے پانچ سات لفظ کے اور لفظ کو ترکیب نہ دو۔ پھر فرماتا ہے کہ "ہمہ" کے لفظ کو جمع کے ساتھ لاؤ مفرد سے نہ ملاؤ۔

---

[1] یہاں سے عبارت سمجھ ہی نہیں آئی

نقل: میں نے "دستنبو" میں لکھا ہے کہ "ہمہ کس داند"۔ ایک شخص نے کہ وہ بھی مولوی کہلاتا ہے۔ میری غیبت میں کہا کہ "ہمہ کس داند" کیا ترکیب ہے؟ ایک لڑکا میرا شاگرد وہاں موجود تھا، اُس نے کہا کہ یہ ترکیب بعینہ صائبؔ کی ہے جیسا کہ وہ کہتا ہے:

ہمہ کس طالبِ آں سروِ رواں ست اینجا　　آب حیواں زلفس سوختگاں ست اینجا

اُس نے کہا کہ تمہارا اُستاد "حاش للہ" کو ماقبل کلمۂ منفی لایا ہے اور یہ جائز نہیں:

حاش للہ کہ بد نمیگویم

میرے شاگرد نے کہا کہ یہ ترکیب انوری کی ہے:

حاش للہ نہ مرا بلکہ ملک را نبود　　با سگِ کوے تو ایں زہرہ و یارا و مجال

مولوی ہدایت علی تمکین کا آج تک میں نے نام نہیں سُنا تھا، چھپے ہوئے رستم ہیں۔ صائبؔ اگرچہ اصفہانی نژاد تھا۔ مگر وارد شاہجہان آباد تھا۔ "انتقام کشیدن" و "انتقام گرفتن" دونوں بول گیا۔ مولوی صاحب لچ فارسی بولتے ہیں۔ لاحول و لا قوۃ الا باللہ۔

"کلیم" بوزن فعیل صیغۂ اسم فاعل ہے مثل کریم و رحیم و بشیر و سمیع و بصیر و کلیم اسمائے الٰہی ہیں۔ کلیم اگر بمعنے ہم کلام لیجیے تو اسم الٰہی اس کو کیوں کر قرار دیجیے؟ حضرت کا مصرع:

ہست کلامے ز کلام کلیم

مخدوش البتہ ہے یعنی یا کلمہ از کلام کلیم، یا کلامے از کلمات کلیم چاہیے۔ کلامے از کلام، مفرد میں سے مفرد کو نکالا چاہیے، گو جائز نہ ہو۔

"گو باش" و "گو باشد" ہرگز محل تردد نہیں، اوہام و وسواس قواعد میں پیش نہیں جاتے:

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب

ہرگز یائے معروف نہیں ہے، یائے مجہول ہے۔ یائے معروف یہاں نامقبول ہے:

خدائے کہ بالا و پست آفرید

ایسا خدا، ایسا کریم، اس تحتانی کو یائے وحدت کہو، یائے توصیف کہو، یائے تعظیم کہو، جس طرح کہو، مجہول آئے گی۔

(۲۴۴)

بندہ پرور،

پرسوں تمہارا خط آیا آج جواب لکھ رکھتا ہوں، کل ڈاک میں بھجوادوں گا۔ میرا حال کیوں پوچھو؟ اپنے کو دیکھو جو تمہارا ڈھنگ ہے، وہی میرا رنگ ہے۔ بشورد اورام مرض خاص اور رنج عام، یہ ایک اجمال۔ دوسرا اجمال سنو کہ مہینے بھر سے صاحب فراش ہوں۔ صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں محل سرائے اگرچہ دیوان خانے کے بہت قریب ہے، پر کیا امکان جو جا سکوں۔ صبح کو ۹ بجے کھانا یہیں آجاتا ہے۔ پلنگ پر سے کھسل پڑا، ہاتھ مُنہ دھو کر کھانا کھایا، پھر ہاتھ دھوئے، کلی کی، پلنگ پر جا پڑا۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے۔ اُٹھا اور حاجتی میں پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ مدتوں سے یہ مرض ہے کہ پیشاب جلد جلد آتا ہے۔ اس صاحب فراش ہونے کو دیکھو اور دم بدم تقاضائے بول کو دیکھو۔ پاخانے اگرچہ دن رات میں ایک دفعہ جاتا ہوں مگر صعوبت کو تصور کرو۔ ایک پھوڑا دائیں پہونچے میں، جس کو ساعد کہتے ہیں، دو پھوڑے بائیں پہونچے میں۔ یہ سہل ہیں۔ بائیں پاؤں میں کف پا و پشت پا سے لے کر آدھی پنڈلی تک ورم اور ورم بھی سخت۔ رواد عات و محللات سے کچھ نہ ہوا۔ اب تجویز ہے کہ نیب کا بھرتا باندھیے، جب پکے پھوٹے، تب مرہم لگائیے۔ کہو